میر ظہیر عباس روستمانی

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

رہائی

حسن منظر

۹ پہلی بار چھپنے والے افسانے - ۲۵۶ صفحات

آگہی پبلیکیشنز حیدرآباد برلب دریائے سندھ
اپریل ۱۹۸۱ء

Scanned by CamScanner

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

"رہائی" مصنف: حسن منظر

آگہی پبلیکیشنز حیدرآباد - سندھ

طبع اوّل اپریل ۱۹۸۱ع - تعداد ایک ہزار

سرورق: ع. ق. شیخ - خطّاطی: شرجیل

کمپوزیٹر: جان محمد (ڈوگر) - مشین مین: محمود

چھاپہ خانہ: سھٹي پرنٹرز، الھند و کچو - حیدرآباد سندھ

(جملہ حقوق بنام مصنف محفوظ تصور کئے جائیں)

قیمت ۲۲ روپے

خط و کتابت کا پتہ

۸ سی بلاک اے - یونٹ نمبر ۱۰

لطیف آباد - حیدرآباد - سندھ

میر ظہیر عباس روستمانی

Scanned by CamScanner

حسن منظر

رھائی

میر ظہیر عباس روستمانی

Scanned by CamScanner

چند لفظ

ادب کی کوئی بھی صنف ہو موجودہ دور میں اردو کے اکثر ادیبوں کیلئے اپنی تخلیقات کو کتاب کی شکل میں قاری تک پہنچانے کا ارادہ کرنا بعد میں ایک حوصلہ شکن تجربہ بن جاتا ہے۔ ممکن ہے آنے والا زمانہ ان پر مہربان ثابت ہو اور کروڑوں پڑھنے والوں کیلئے لکھی ہوئی تخلیقی ادب کی ہر کتاب کا مقدّر ایک ہزار کی تعداد میں چھپنا نہ رہے۔ اور شاید وہ وقت بھی آئے جب بجائے چند ادب دوست لوگوں کے — جو کتب فروش کی دوکان میں کتاب ڈرتے ڈرتے اٹھاتے ہیں اور قیمت دیکھ کر اسے فوراً ہی واپس رکھ دیتے ہیں — ملک کی اکثریت پڑھی لکھی ہو اور اس کے پڑھنے کے حوصلے کو نہ کتاب کی قیمت پست کر سکے نہ شعور کا فقدان۔

میں نے سندھی ادیبوں کی اس روش کو بہت سبق آموز پایا کہ جو کچھ عوام کیلئے لکھا جائے وہ ان تک پہنچتا بھی رہے۔ اس معاملے میں آج کل کے سندھی ادیب نہ عمدہ کاغذ کے پابند ہیں نہ جلد کی خوبصورتی اور اعلیٰ درجے کی خطّاطی کے محتاج۔ افسانوں کے اس مجموعے کو چھپوانے میں جو مدد مجھے سندھی ادیبوں اور ادب دوستوں سے ملی ہے میں اس کیلئے ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

صہبا لکھنوئی صاحب، ادیب اور مدیر افکار، میرے آن دوستوں میں سے ہیں جنہوں نے مجھے اردو ادب سے بچھڑنے نہیں دیا ہے۔ انہوں نے اس دور میں اردو ادب کی آبیاری جاری رکھی ہے جسے طویل سوکھے کا موسم کہنا چاہئیے۔ الیاس عشقی صاحب اردو، فارسی اور سندھی کے ادیب اور شاعر ہیں اور ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے اسٹیشن ڈائریکٹر۔ میری تحریر کے بارے میں ان کی رائے جس سے بیک کور مزین ہے میرے لئیے باعث افتخار ہے۔ خالد وہاب صاحب صدر شعبۂ اردو، پرنسپل گورمنٹ کالج بدین، افسانہ نگار اور صدر مجلس مصنفین حیدرآباد ہیں۔ ان کی رائے نے جو سرورق پر چھپی ہے مجھے اس دبدبے میں ڈال دیا ہے کہ یہ افسانے عام پڑھنے والوں کی نظر میں اس معیار پر پورے بھی اترینگے یا نہیں جس کا اظہار ان سطور میں کیا گیا ہے۔

کتاب کا سرورق محترمی ع-ق-شیخ نے میری فرمائش پر تیار کیا ہے۔ شیخ صاحب برش اور رنگ کی دنیا کے ایک بلند پایہ آرٹسٹ بھی ہیں اور سندھی کے ادیب بھی۔ آگہی پبلیکیشنز کا مونو گرام اور خطاطی ایک اور سندھی ادیب + آرٹسٹ شرجیل کا تخلیقی کارنامہ ہیں۔

اس کتاب کے بیشتر افسانے مجلس مصنفین حیدرآباد کی نشستوں میں پچھلے چند سالوں میں تنقید کیلئیے پیش کئیے گئیے تھے جس کیلئیے میں اراکین مجلس کا ممنون ہوں۔ اس کے علاوہ تقریباً یہ سب ہی افسانے ادیبوں کی ایک ایسی نشست میں بھی پڑھے جا چکے ہیں جس کا کوئی نام نہیں ہے اور جو غالباً حیدرآباد میں ادیبوں کا واحد بے تکلّف کلب ہے جس کی کوئی میمبر شپ فیس بھی نہیں ہے۔ اپنے اس کلب کے دوستوں کی استعانت کا میں معترف ہوں۔ انھی دوستوں میں سے ڈاکٹر مبارک علی خاں، استاد تاریخ،

Scanned by CamScanner

جامعہ سندھ ہیں جو کتاب کی چھپائی کے سفر میں میرے ساتھی رہے ہیں۔ رفیق شیخ اسی جامعہ میں شعبۂ صحافت کے طالبعلم ہیں اور پروف پڑھنے کی صعوبتوں سے وہ بھی میرے ساتھ ساتھ گذرے ہیں۔

تہمینہ جعفری نے افسانہ پورنماسی۔اماوس (اردو داں حلقہ لفظ پور نماشی سے زیادہ مانوس ہے) کو میری تحریر سے پڑھی جانے والی تحریر میں منتقل کرنے کا مشکل کام انجام دیا ہے۔ چند اور بھی ساتھی ہیں جنھوں نے اس کام میں میری مدد کی ہے۔ کتاب کو چھپوانے کا مالی بوجھ ڈاکٹر طاہرہ منظر حسن کو برداشت کرنا پڑا ہے۔

کتاب کی تیاری میں سوھنی پرنٹرز کے محنت کش عملے اور مالکِ مطبع اور سندھی ادیب سید طارق اشرف صاحب کے تعاون کو میں نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

حسن منظر

حیدرآباد برلبِ دریائے سندھ۔

۲۲۔ اپریل ۱۹۸۱ع

Scanned by CamScanner

اپنے اکیلے مرحوم بھائی

نیّر

کے نام

پیدائش: لاہور اگست ۱۹۵۱ء

وفات: کراچی مئی ۱۹۶۲ء (لمفوسارکوما، سینے کے کینسر سے)

جس نے مرنے سے تھوڑی دیر پہلے شدید سینے کے
درد کی حالت میں ہسپتال کے کمرے سے باہر ایک
درخت پر گلہری کو دیکھ کر مجھے اپنی اس
مسرت میں شریک کیا تھا۔

Scanned by CamScanner

زمین کا نوحہ

پھر وہ وقت آیا کہ اعداد و شمار میں دل چسپی رکھنے والوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اب اخباروں میں ضرورت رشتہ کے نام سے جو اشتہار چھپتے ہیں ان میں زیادہ تر بیوی کی مانگ ہوتی ہے، شوہروں کی مانگ پہلے کم ہوئی پھر گھٹتے گھٹتے یکسر غائب ہو گئی۔ اشتہاروں کا مضمون بھی بدلنے لگا۔ لوگوں کے مطالبات کم ہوتے جا رہے تھے۔ پہلے اگر کسی کو کسی خاص علاقے، کسی خاص ذات، مذہب اور مذہب کی کسی خاص شاخ کی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش تھی تو اب وہ اس خاص علاقے سے باہر کی لڑکی سے شادی کرنے کو بھی تیار تھا۔ لیکن باقی شرائط بدستور تھیں، مثلاً لڑکی کا رومن کیتھولک، شیعہ یا برہمن ہونا ضروری تھا اور اگر وہ شادی کرکے کسی باہر کے ملک میں بھی جاتی تو رہتی کم از کم اپنے ہی کسی ہم وطن کے گھر میں۔

پھر لڑکا محض عیسائی، مسلمان یا ہندو لڑکی سے شادی کرنے پر آمادہ نظر آنے لگا اور اس پر مصّر نہیں تھا کہ لڑکی میرو نائیٹ کرسچین، بوھری مسلمان یا چٹر جی برہمن ہی ہو۔

ایسا لگتا تھا لڑکے اور انکے ماں باپ کم سے کم
آنے والی بہو یا بیوی کے معاملے میں قناعت پسند ہوتے جارہے
تھے۔ خواہ بجلی کے نئے نئے آلات خریدنے اور سامان آسائش
جمع کرنے کے معاملے میں انکی حرص پہلے سے بھی زیادہ
بڑھ گئی تھی۔ ایک نئی تبدیلی جو ان اشتہاروں کے مضامین
میں پیدا ہوئی وہ خاصی حوصلہ افزا تھی یعنی یہ کہ اب لڑکی
کا خوبصورت یا گورا ہونا لازمی نہیں رہا تھا۔ بعد میں
اسکا محض لڑکی ہونا ہی کافی رہ گیا۔ لڑکی کی عمر کا
ذکر پہلے اشتہار کی پہلی ہی سطر میں ہوتا تھا، بعد میں
آخر میں ہونے لگا اور پھر حذف کیا جانے لگا۔ اب نہ کسی
کو صوم و صلواۃ کی پابند، خوبصورت، چھریرے جسم،
گندمی رنگت، کنواری اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کی ضرورت
تھی، نہ ہی اسکا بیس اور پچیس کے درمیان ہونا ضروری تھا۔
یہ سب مطالبات فرسودہ ہوتے جا رہے تھے۔

لیکن اعداد و شمار میں دلچسپی رکھنے والے حضرات
اسوقت چونک پڑے جب ایک ملیالی اخبار میں ڈچ اور جرمن
شادی کے خواہشمند لڑکوں کے نام پڑھنے میں آئے اور اردو
کے اخباروں میں ٹرینیڈاڈ اور امریکہ میں بسنے والے لڑکوں نے
بیوی کی ضرورت کے اشتہارات چھپوانے شروع کردیئے۔ کچھ
عالمی پیمانے پر کام کرنے والی شادی کرانے کی ایجنسیاں
معرض وجود میں آنے لگیں اور لوگ سمجھے شاید انکا تعلق
عالمی ادارہ صحت یا اقوام متحدہ کے ادارہٗ نشرواشاعت سے
ہے۔ اور یہ ادارے ممکن ہے اقوام عالم کو ایک نسلی برادری
میں گوندھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔
کیونکہ اب انگریزی اور فرانسیسی اخباروں میں ریڈانڈین
اور نیگرو مردوں کے لئے بیویاں چاہئیے ہیں کے گروپ اشتہارات
چھپ رہے تھے اور اردو ہندی کے اخباروں میں بھی ہر ملک

Scanned by CamScanner

کے شادی کرنے کے خواہشمند مردوں کی فہرستیں چھپنے لگی تھیں۔ ایسا لگتا تھا دنیا بھر میں عورتوں کا قحط پڑ گیا ہے۔

ان اشتہاروں میں جن مطالبات نے سب سے آخر میں دم توڑا وہ مذہب اور نسل کی قید کے تھے۔ یہ مطالبات سب سے زیادہ سخت جان تھے لیکن بالآخر انسان اب ان سے بھی دست بردار ہونے پر آمادہ نظر آرہا تھا۔ مثلاً کسی کے ہریجن ہونے پر اب کسی کو اعتراض نہیں رہا تھا اور بعض اخباروں میں اس قسم کے اشتہارات بھی دیکھنے میں آئے:

> "ایک سفید فام جنوبی افریقہ کا باشندہ، عمر تقریباً ۴۵ سال، پیدائشی لحاظ سے ڈچ ریفارمڈ چرچ سے تعلق رکھنے والا، مالی اعتبار سے آسودہ شادی کا خواہشمند ہے۔ لڑکی کا کسی نسل یا مذہب سے ہونا ضروری نہیں ہے۔"

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب عورتیں اخباروں میں چھ چھ اور آٹھ آٹھ نوزائیدہ بچوں کو صاف ستھرے سفید ڈائیپرز یا پوتڑوں میں لپٹا ہوا دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں جو سب ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور اخبار میں ایک قطار میں لیٹے ہوئے دکھائے جاتے تھے۔ بعض اخباروں میں انکی ماں کی تصویر بھی ہوتی تھی جو ایسا لگتا تھا، فوٹوگرافر کے "ذرا ہنسئے تو" پر کمزور سی ہنسی ہنس رہی ہے۔ بعض عورتوں کو ایسی ماں بسورتی ہوئی لگتی تھی۔ اور، کچھ، جو ذرا منہ، پھٹ ہوتی تھیں بے ساختہ کہہ اٹھتی تھیں "عورت ہے یا کتیا۔ پورے دس بیاہی ہے۔" ایسے

موقع پر ان میں سے کسی کا لڑکا اپنی ماں سے پوچھ بیٹھتا "امی کتنے بچے دیئے ہیں اس عورت نے ـــ"؟ او ماں کے نو یا دس کہنے پر تعجب سے کہتا تھا۔ "اچھا اپنی ڈوگی سے بھی زیادہ!"

اب کالم نگاروں کی جگہ اخباروں میں سائنسدانوں نے لے لی تھی اور کالم نگاروں کا کام انکی تحریر کی نوک پلک سنوارنا اور اُسے عام فہم بنانا رہ گیا تھا۔ ہر طرف جینیٹکس کا زور تھا۔ جین اور کروموسومز کے الفاظ اب گاؤں والوں کے لئے بھی نئے نہیں رہے تھے اور اکثر ایکس وائی (X-Y) اور ایکس ایکس (X-X) کے بارے میں بھی پوچھ بیٹھتے تھے کہ کیا ہوتے ہیں۔ ہر شخص جاننا چاہتا تھا لڑکیاں دنیا میں کیوں کم ہوتی جا رہی ہیں اور جسکے گھر اب قدرتی طور سے یا فرٹی لیٹی پلز لینے کے بعد بچہ ہوتا ہے وہ لڑکا ہی کیوں ہوتا ہے یا یہ کہ عورتوں کی کوکھ سے بچوں کی ایک پوری جھول ایک ہی دفعہ میں کیسے جنم لے لیتی ہے جو Viable نہیں ہوتی ہے۔ اور یہ نیا لفظ بھی اب ہر شخص کے لئے پرانا ہوگیا تھا۔ وہ جانتے تھے اس پوری جھول کے لئے ایک گروپ قبر کی ضرورت ہوگی۔ اور اسے بغیر رسومات کے دفنا دیا جائے گا کیونکہ ان میں سے اکثر نے پیدا ہونے کے بعد نہ ہواں کیا تھا نہ ھُوآں اور نہ ہی ہاتھ پیر ہلائے تھے۔ ایسے بچے بلی یا خرگوش کے بچوں کی طرح گلابی، بالوں سے عاری، آنکھیں بند کئے ہوئے گیلے گلاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان میں انسان کے بچوں جیسی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔

جینیٹکس کے ماہر چلا رہے تھے کہ کسی وجہ سے جسکا تعین فی الوقت نہیں کیا جا سکتا تھا عورتیں اس قابل

ہی نہیں رہی ہیں کہ انکے ہاں لڑکی پیدا ہو اور اسکی تصدیق آن والنٹیر عورتوں کے کروموسومز کا مطالعہ کر کے ہو چکی تھی جنہوں نے اپنے آپ کو تجربات کیلئے پیش کیا تھا۔

انہی دنوں ایک پارٹی میں جہاں بچوں کے ماہر معالج بھی موجود تھے اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ آجکل ہر ماں یہ شکایت کرتی ہوئی کیوں نظر آتی ہے کہ اسکا بچہ کھاتا نہیں ہے۔ ہر ماں کو بچے کی خوشامد کرنی پڑتی ہے لالچ دینی پڑتی ہے، تب وہ منہہ بناکر ایک آدھ لقمہ لیتا ہے۔ ماں پلیٹ لئے اسکے آگے پیچھے پھرتی ہے اور بچے کے نہ کرتے رہنے پر روہانسو ہوکر بیٹھ جاتی ہے کہ بچہ کیسے بڑا ہوگا۔ جن آراء پر لوگ سنجیدگی سے غور کر رہے تھے وہ یہ تھیں کہ مائیں گھر سے باہر رہتی ہیں اور اپنے اس احساسِ جرم کو کم کرنے کیلئے بچے کو زبردستی کھلاکر گویا اسکا کفارہ ادا کرتی ہیں۔

ایک صاحب نے کہا "ممکن ہے وہ اس کمی کو پورا کرتی ہوں جو بچپن میں انکا مقدور رہی ہو"۔

اُنکی بات کو بھی بھر کم جانا گیا۔ لیکن جب ایک آدمی نے بڑی معصومیت سے کہا "عجیب بات ہے، ہمارے بچپن میں ہر بچہ ہر وقت کھانے کی الماری اور گنجینے کو کھکھوڑنے اور چھینکے تک کسی طرح پہنچ جانے کی تاک میں رہتا تھا اور اس بات پر ڈانٹا جاتا تھا کہ کیا ہر وقت پیٹ کو اناڑی کی بندوق کی طرح بھرے جاتا ہے۔ اور آج کل ـــ ـــ ـــ"۔

تو کسی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "آپ کے خیال میں یہ سب تبدیلی بدلے ہوئے زمانے کی لائی ہوئی ہے۔"

Scanned by CamScanner

اس آدمی نے کہنا چاہا "میرا مطلب ہے پچھلے زمانے میں ــــــ"

مداخلت کرنے والے نے تلخی سے کہا "آپکا مطلب ہے پچھلا زمانہ ہی اچھا زمانہ تھا جب بچے بن کہے کھاتے تھے اور اب کھلانے پر بھی نہیں کھاتے ـــ"

اس آدمی نے سنجیدگی سے لیکن جھینپتے ہوئے کہا "معاف کیجئے میرا تعلق سائنس سے نہیں ہے اسلئے مجھے عام الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے آج کل کے بچوں نے اس وجہ سے کھانا چھوڑ رکھا ہے کہ یہ آئے دن جو ایٹمی تجربے ہو رہے ہیں، تابکار ذرات کا گرنا، راکٹس کا چھوڑا جانا، نیوکلیئر آلات کا سمندروں اور پہاڑوں میں کھویا جانا، یورینیم کا کچرہ، کیڑے مار دوائیں جو فصلوں پر چھڑکی جاتی ہیں، فوڈ پریزرویٹوز (کھانے کو محفوظ رکھنے والے کیمیکلز) مونوسوڈیم گلوٹامیٹ وغیرہ۔ ہوا میں، پانی میں ــــــ"

پارٹی میں شریک حضرات ایکدم خاموش ہوگئے اور خاموشی سے کونیاک اور وھسکی پینے لگے۔

اعتراض کرنے والے کا رخ ابھی تک اس سیدھے سادے آدمی کی طرف تھا اور اسکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیونکر اس سے اپنا پیچھا چھڑائے۔ چنانچہ وہ پیالے کو اپنی ناک کے پاس لیجاکر اسے سونگھنے لگا۔

سیدھے سادے آدمی نے اپنا گلاس خالی کیا اور پاس سے گذرتے ہوئے ویٹر کی ٹرے پر اسے رکھ کر اس نے سر جھکاکر ان لوگوں سے کہا "You will excuse me" اور خاموشی سے ایک اور گروپ کی طرف چلا گیا۔

اسکے بعد وہ زمانہ آیا پہلے جہاں جہاں سمندر کے کنارے اور بازاروں میں خوش‌رنگ ساڑھیاں، اسکرٹس اور سارونگ

Scanned by CamScanner

اور کباپا پہنے ہوئے لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ گھومتی نظر آتی تھیں اور کم عمر عورتیں شام کو بچوں کے ہرہمز لئے ہوا خوری کیلئے نکل آتی تھیں اب وہاں صرف ادھیڑ عمر کی عورتیں اور بوڑھیاں نظر آنے لگیں۔ جنکے کپڑے عمر کے لحاظ سے پھیکے رنگوں والے اور ڈھیلے ڈھالے ہوتے تھے۔ ڈھیلے ڈھالے اسلئے کہ وہ عمر کے اُس دور سے گذر چکی تھیں جب جسم ظاہر کرنے کی چیز ہوتا ہے۔

وہ تھوڑی دور چل کر تھک کر بینچ پر بیٹھ جاتی تھیں اور نوجوان انکے پاس سے بے تعلقی سے گذر جاتے تھے اور اکثر چھٹی کا دن مچھلی پکڑنے میں گذارتے تھے۔ مچھلی پکڑنا اب ایک آرٹ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا کیونکہ مچھلیاں سمندروں میں نایاب اور دریاؤں اور جھیلوں میں کمیاب ہوگئی تھیں۔ فیکٹریوں سے نکلنے والا زہریلا پانی اور سمندر میں ڈوبنے والے بڑے بڑے تیل بردار جہازوں کا تیل انکی نسلوں کا خاتمہ کر چکے تھے۔ پرندے، جانور اور پانی میں بسنے والے بہرحال انسان کی طرح سخت جان نہیں ہوتے ہیں کہ اِن نئی آفات کا مقابلہ کر پاتے۔

ہر زبان میں پہلے کافی عرصہ تک عشقیہ شاعری نے ایکبار پھر زور پکڑا اسکے بعد شاعروں نے زیادہ گنجلک موضوع اپنانے کی کوشش کی اور پھر قلم رکھکر بیٹھ گئے۔ رسالوں میں کہانیوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی اور فلمیں بھی کم بن رہی تھیں۔ پرانے لکھنے والے اسکے عادی تھے کہ کسی مہم پر جانے والے کی ساتھی ایک لڑکی ہو لیکن لڑکی اب ناپید تھی تو کہانی کیلئے کہاں سے آتی!

ٹارزن کیلئے بھی کسی لڑکی کا کسی گوریلے کی گرفت میں ہونا ضروری تھا۔ لیکن جب انسانوں ہی کیلئے لڑکیاں ناکافی تھیں تو گوریلوں کیلئے کہاں سے آتیں! کہانیوں

Scanned by CamScanner

میں کس کو جیتنے کیلئے جد و جہد پیدا کی جاتی اور کون عورت کسی ڈاکو کی محبوبہ بنکر اسکے ساتھ پولیس سے لڑتی ہوئی ہلاک ہوتی! یہ سب باتیں پرانی ہو گئی تھیں اور نئی نسل جو اب اتنی نئی نہیں رہی تھی اکتاہٹ سے ان پرانی فلموں کو دیکھتی تھی۔

سنیما ہالوں میں جب مرد اور عورت کے درمیان پیدا ہونے والے شدید جذبات کا کوئی سین آتا تھا تو یہ نئی نسل والے زور زور سے جمائیاں لیتے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر سنیما ہال بند ہوگئے اور انمیں حکومتیں جنگی اسلحہ رکھنے لگیں۔ فلم اسٹوڈیوز سے ٹینک گیراجوں کا کام لیا جانے لگا۔ پرانی نسل والے، نوجوانوں کے اس رجحان سے خائف سے تھے "مان لیجئے کل پھر سے لڑکیاں پیدا ہونے لگیں تو یہ لوگ انکی طرف مائل بھی ہونگے یا نہیں؟" اور اسکا قوی امکان تھا کہ لڑکیاں دوبارہ پیدا ہونگی۔ کیونکہ ہر بڑے تحقیقی سینٹرمیں اس عالمی مرض کی وجوہات کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ جاپان، چین، امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی قسم کے ممالک آئے دن اِس قسم کا اعلان کرتے رہتے تھے کہ ایک نئی دوا جو اس وقت جانوروں پر ٹیسٹ کی جا رہی ہے اسکے اثرات حوصلہ افزا ہیں۔ مثلاً ارجنٹینا میں ایک گائے اب دھڑا دھڑ محض بچھیاں ہی پیدا کئے جا رہی تھی اور وہ بھی ہر تیسرے مہینے۔ بعض ملکوں سے بیک وقت دو قسم کے مژدے سننے میں آئے تھے:

ایک مہارشی یا مجذوب کی دی ہوئی مٹی پھانکنے سے ایک عورت کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے جسے ۱۶ برس تک ہر قسم کے گرہن سے بچنا ہوگا حتیٰ کہ منش کے نظر گرہن سے بھی اور فلاں سینٹر میں ایک نئی دوا دریافت ہوئی ہے جسکے

استعمال سے چوہوں کی دوسری نسل میں نر اور مادہ کا تناسب ایک اور دو کا ہے اور تیسری نسل میں ۱ اور ۳ کا اور دسویں نسل تک پہنچتے پہنچتے پھر چوہیا صرف چوہیاں پیدا کر رہی ہے۔ ایکبار پھر اخباروں کے کالموں میں سائنسدانوں کا زور بڑھ گیا تھا۔ یہ ٹھیک تھا اصلی دوا ابھی دریافت کی جانی باقی تھی لیکن یہ کتنی بڑی بات تھی کہ ایک نئی پروڈکٹ (جسے ۲۱۴ء J 7314) کو کتیوں کو ایسٹرس سائیکل کے پہلے ہفتے میں دینے سے انسان ان سے محض کتے پیدا کروا سکتا تھا اور اگر یہی پروڈکٹ سائیکل کے آخری ہفتے میں دی جاتی یعنی جانوروں کے حیض سے پہلے تو نئی نسل میں کتیاں ہی کتیاں ہوتیں۔ مگر اس نئی دریافت کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ اس سے خود کتیا کے تھنوں میں کینسر کے اثرات رونما ہونے لگے تھے اور فی الحال اسے عورت پر آزمانا نا درست تھا۔

پرانے لوگ اکتائے اکتائے سے لگتے تھے جیسے وہ ان تمام خبروں سے بیزار ہو چکے ہوں اور انہیں دنیا ختم ہوتی نظر آ رہی ہو۔ انمیں سے اکثر رات کو سوتے میں چلانے لگتے تھے اور پوچھنے پر بتاتے تھے 'پہاڑ اڑتے پھر رہے ہیں' یا یہ کہ 'دنیا کے گلوب میں آر پار ایک بہت بڑا چھید ہو گیا ہے جسمیں سے ہو کر گنگا، جمنا کا پانی مسوری، مسس سپی میں گر رہا ہے اور مسوری، مسس سپی کا گنگا جمنا میں'۔

دوسری نسل والے فرد جو ابھی تک شادی کے خواہشمند تھے ہر اخباری رپورٹ کو دلچسپی سے پڑھتے تھے اور بےوجہ ایک دوسرے سے جھگڑتے رہتے تھے۔ انمیں سے اکثر دن میں چرس کے سگریٹ پھونکتے تھے اور رات کو افیون کے ڈوڈے چائے کی پتیوں کے ساتھ ابال کر پیتے تھے۔ اب اکثر

Scanned by CamScanner

جگہ جگہ کھلے عام افیون کے خوبصورت کھیت نظر آتے تھے اور ان پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔

لیکن تیسری نسل ان دو نسلوں سے مختلف تھی۔ ان میں سے اکثر نے کسی عورت کو شاذونادر ہی دیکھا تھا اور اگر دیکھا بھی تھا تو ایسی کو جس کا منہہ پوپلا تھا یا مصنوعی دانتوں سے مرصع اور آنکھیں گول شیشوں کے پیچھے سے بے جان سی نظر آتی تھیں۔ ایسی عورت کو دیکھکر بھلا کون شاعری کرتا!

اپنی بے رحمی میں ان میں سے کوئی کوئی کہہ اٹھتا تھا "یہ بڑی بی! انکو دیکھکر کبھی لاکھوں کے دل دھڑک اٹھتے تھے! یقین نہیں آتا"۔

ایسے ہی ایک موقعہ پر ایک بوڑھے نے کہا تھا "ہم جب تمہاری عمر کے تھے اور ہمارے ماں باپ اپنے ان ملکوں کی خوبصورتی کا ذکر کرتے تھے جہاں سے وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے، وہاں کے دریاؤں کا، گھاس سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کا اور جنگلوں کا اور انمیں بسنے والے جانورں کا تو ہم بھی ہنستے تھے۔ کیونکہ ہمیں بھی یقین نہیں آتا تھا"۔

لڑکے کلاسیکی ادب سے بیزار تھے جسے اب لائبریریوں میں دیمک چاٹ رہی تھی اور پرانی فلمیں ڈبوں میں بند پڑے پڑے چپک کر ڈھما بن چکی تھیں۔ اس نسل کے ذہن میں عورتوں کا بچنا نہ بچنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ صرف لڑکوں میں کھیل کر بڑے ہوئے تھے اور بہن نام کی کسی رفیق کو نہیں جانتے تھے۔

تحقیقی کام کی رفتار کا تعلق عورتوں کے صفحۂ ہستی سے معدوم ہونے کی رفتار کے تابع تھا۔ جوں جوں عورتیں اور بالخصوص وہ عورتیں جن سے ابھی بچے پیدا کئے جانے کی

توقع کی جاسکتی تھی کم ہوتی جا رہی تھیں، تیوں تیوں حکومتیں اپنے خزانوں کا دھارا بجائے خلا اور سیاروں کو تسخیر کرنے والے اداروں کے، "انسان کو بچاؤ" فنڈ کی طرف موڑنے پر مجبور ہوتی جا رہی تھیں۔ سائنسدان دن اور رات تابکاری، کروموسومز اور جینیٹکس (Genetics) پر اخباروں میں لکھ رہے تھے اور ایک دوسرے پر کیچڑ بھی اچھال رہے تھے۔ انکا خیال تھا کہ اگر فلاں تجربہ بیس سال پہلے فلاں ملک میں نہ کیا گیا ہوتا تو آج یہ صورتِ حال پیدا نہیں ہوتی۔ جس ملک میں بیس سال پہلے وہ تجربہ کیا گیا تھا وہاں کے سائنسدان اور سیاستدان اول الذکر ملک پر الزام دھرتے تھے کہ اس جانب پہلا قدم پچاس سال پہلے خود انہوں نے اٹھایا تھا۔ ایسے کالم نگار جنکا کالم ہر ملک میں چھپتا تھا، میانہ روی سے کام لے رہے تھے اور انکی رائے میں یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ ہمیں ابھی بھی نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ عورتیں ایک خاص قسم کے بانجھ پنے کی کیوں شکار ہوگئی ہیں اسلئے جب تک کہ وجہ یا وجوہات کی صحیح نشاندہی نہ ہوسکے ہر قسم کی رائے قبل از وقت تھی اور علاج تھوڑا دور۔

ایک ادیب نے جسے قلم سے دست بردار ہوئے تقریباً نصف صدی ہو چکی تھی جب اپنی پرانی ڈائریاں پڑھنی شروع کیں تو اسے ایک جگہ اپنا یہ عجیب خواب پوری تفصیل سے لکھا ہوا نظر آیا:

"آج سخت گرمی تھی، میں کھانے کے بعد دوپہر کو اخبار پڑھ رہا تھا کہ پڑھتے پڑھتے مجھے نیند آ گئی، مجھے دور سے ایک جزیرہ نظر آرہا تھا جس پر ناریل کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ اسکے پیچھے کا آسمان صاف و شفاف تھا، جیسے سفید چادر کو دھوبی نے زیادہ نیل دے دیا ہو۔ خود میں جزیرے سے دور تھا اور کسی ماہی گیر کی کشتی میں تھا۔

Scanned by CamScanner

ہوا ہلکی تھی اور جیسے مجھے خود بخود پتہ چل گیا تھا کہ ہم بحرالکاہل میں ہیں- میرے ساتھی جو جاپانی بھی ہوسکتے تھے اور فلپینو بھی کشتی کے دوسرے سرے پر کھڑے مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھے- میں اس جزیرے کو دیکھ رہا تھا۔ کسی نے جیسے ہوا میں سے مجھ سے کہا وہ بکنی اڈبول ہے اور تب ہی وہاں سے، ناریلوں کے جھنڈ میں سے، ایک دھوئیں کا ستون ابھرا جس نے جزیرے کو چھپا لیا- ہمارے اوپر راکھ گر رہی تھی جیسے پومپیائی پر کبھی گری ہوگی- میرے ساتھی پانی میں کود پڑے حالانکہ وہاں شارکس بھی تھیں- میں ڈوبتی ہوئی کشتی میں جیسے موجیں جھنجھوڑ رہی تھیں تختے کے نیچے چھپنے لگا اور جب میں جاگا تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا تھوڑی سی راکھ میری ایک ران پر بھی گری ہے اور جیسے وہاں جلن پڑ رہی ہے"-

ادیب کو تعجب تھا اتنے اچھے خواب کی نیوز ویلیو کو وہ اس زمانے میں کیسے نظر انداز کر گیا تھا-
اسنے اپنا یہی خواب ایک رسالے کو اس خط کے ساتھ چھپنے کیلئے بھیجا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ موجودہ صورت حال ان سالہا سال کے تجربات کا نتیجہ ہے جو ان جزیروں اور ریگستانوں میں کیئے جاتے رہے ہیں جہاں کے بسنے والوں کو اکثر انکا علم بھی نہیں ہوا ہے-
وہ چھ ماہ تک اس خط کے چھپنے کا انتظار ہر ہفتہ کرتا رہا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ غالباً اس خواب کی وہی نیوز ویلیو صحیح تھی جو آج سے پچاس سال پہلے اس نے لگائی تھی-

اور پھر بالآخر وہ وقت آگیا جب ایکدم لوگوں کو احساس ہونے لگا کہ عورتیں دنیا سے غائب

ہو چکی ہیں۔ ہر گاؤں، ہر قریہ یہ بتا سکتا تھا کہ اس میں رہنے والی آخری عورت کب اور کہاں مری تھی اور اب وہ کہاں دفن ہے۔ حتیٰ کہ ایک کروڑ سے زیادہ آبادی کے شہر والے بھی اپنے شہر میں مرنے والی آخری پانچ یا دس عورتوں کے نام گنا سکتے تھے۔ مثلاً شیلا اس سے پہلے جودھا اس سے پہلے سکینہ۔ اس سے پہلے ———

اور یہ لسٹ ہر کس و ناکس سے معلوم کی جا سکتی تھی۔ لیکن ان ناموں کا جاننا اب اتنا ہی کارآمد یا بے سود تھا جتنا کسی دنیا سے معدوم ہو جانے والے پرندے کا۔ مثلاً ڈوڈو کا جو سترھویں صدی تک ماریشس میں پایا جاتا تھا اور اب اسمیں کسے دلچسپی تھی کہ آخری ڈوڈو کی ہڈیاں کہاں کی مٹی میں دبی ہوئی تھیں۔

انسان کو بچاؤ سینٹر کی طرف سے ہونے والے اس اعلان نے کہ "دوا" دریافت کرلی گئی ہے۔ باقی ماندہ عورتوں کی تلاش کی مہم کو تیز کردیا اور جب لوگوں کو یہ پتہ چلا کہ اس دوا کے کھانے کے بعد جس عورت کے بھی بچے ہونگے قدرتی انداز سے ہونگے کوئی نر کوئی مادہ تو موت کے خوف نے انکی اس مہم پر مہمیز کا کام کیا کیونکہ کوئی بے نام و نشان نہیں مرنا چاہتا تھا اور وہ بھی اسطرح کہ شہر کے شہر کھڑے رہ جائیں اور ان میں بسنے والا کوئی نہ ہو۔ لوگ پارٹیوں میں اور انفرادی طور پر عورت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ دن بھر ہوائی جہاز کھیتوں پر منڈلاتے رہتے تھے کہ شاید کپاس چننے والوں اور سر پر جنگل سے لکڑیاں لادکر لانے والوں ہی میں کوئی عورت ہو۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار اور دیواروں پر چسپاں کیئے جانے والے اشتہارات میں صرف ایک بات کا تذکرہ تھا "آخری عورتیں یا عورت کہاں ہے؟ دوا دریافت ہو چکی

ھے" - لیکن جیسے جیسے دن بیتے جا رہے تھے اور لوگ جزیروں اور نخلستانوں سے منھ لٹکائے ہوئے واپس لوٹ رہے تھے۔ "انسان کو بچاؤ" والے عالمی ادارے کے کارکنوں کے ہاتھ پاؤں پھولنے کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر ایکدن انھیں ایک خط موصول ہوا جو کسی نے کسی دور افتادہ پہاڑی گاؤں سے ادارے کو بھیجا تھا۔ اسمیں کہا گیا تھا:

"یہاں کے ایک گاؤں میں ایک عورت میں نے کئی بار ایک پہاڑی کی طرف جاتے دیکھی ہے۔ اسکا شوہر اسکے ساتھ ہوتا ہے۔ پہلے وہ اسکول ماسٹر تھا اب بھیڑیں پالنے لگا ہے اور زیادہ وقت اپنی بیوی کی دیکھ بھال میں گذارتا ہے کیونکہ عرصہ ہوا اسکے دو جوان لڑکے ایکا ایکی خون کے خراب ہو جانے سے چل بسے تھے۔ مجھے معلوم ہے وہ عورت کہاں رہتی ہے"۔

اگلی صبح اس پہاڑی پر جسکی چوٹی پر ایک جھیل تھی جسمیں ایک طرف سے گلیشئر گرتے تھے اور دوسری طرف ایک بہت بڑا میدان تھا کئی ہیلی کوپٹر ایک ساتھ اترے انکے پنکھوں کی آواز سنکر بھیڑیں بھاگ کھڑی ہوئیں اور کسی آدمی نے ایک غار میں سے منھ نکال کر آنے والوں کو دیکھا۔

ہیلی کوپٹر سے اتر کر لوگ میدان پار کرتے ہوئے اس غار کی طرف بڑھے گھاس میں چھپے ہوئے کاسنی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول جنھوں نے نئی دھوپ میں نہانے کیلئے بمشکل اپنے سر صبح کی ہوا میں اٹھائے تھے انکے بوٹوں تلے مسلے جانے لگے۔

غار کے پاس پہنچکر انھوں نے مختلف زبانوں میں اس

آدمی کو پکارا اور تالی بجاکر آسے مخاطب کرنا چاہا۔ لیکن اندر مکمل خاموشی رہی۔

جب آن میں سے ایک آدمی نے کھال کے پردے کو اٹھاکر اندر جھانکنا چاہا تو اندر چھپے ہوئے آدمی نے غصے سے کہا "کیا بات ہے؟"

"ہم عالمی ادارہ انسان کو بچاؤ کی طرف سے یہاں آئے ہیں"۔

اندر والے نے پہلے سے بھی زیادہ غضبناک آواز سے پوچھا۔

"کس لئے؟"

"تم نے اعلان سُنا ہے —— آخری عورت کا —— تمہارے پاس ریڈیو ہے؟"

تھوڑی دیر بعد اس آدمی نے جواب دیا "ہاں میرے پاس ریڈیو ہے — اور میں عرصہ سے اعلان بھی سن رہا ہوں"۔

"ہم دوا لیکر آئے ہیں" ترجمہ کرنے والے نے کہا "تمہاری بیوی کیلئے۔"

"ہمیں کوئی دوا نہیں چاہئے" اس نے غصے سے کہا۔

باہر کھڑے ہوئے لوگ اسکی خوشامد کرنے لگے۔ اگر وہ انسان کی بقا کی خاطر انہیں صرف ایکمرتبہ یہ نئی دوا جو وہ اپنے ہمراہ لیکر آئے تھے اپنی بیوی پر آزمالینے دے! وہ سب کی آخری امید تھی۔

وہ پردہ اٹھاکر باہر نکل آیا اور انکے سامنے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اندر چھپی ہوئی عورت غار کے منہ کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہ زندگی کی شام کو پہنچ رہی تھی۔ دونوں نڈر نظر آتے تھے۔

آخرکار اسنے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے ان سے

ترش لہجے میں کہا "بالکل نہیں، میرے لئے میری زندگی سب سے زیادہ اہم ہے"۔

"بنی نوع انسان کی نہیں؟"

اُس نے آنکھیں چند هیاکر کہا "آپکو کب سے بنی‌نوع انسان کی فکر لاحق ہوگئی ہے؟ آپ نے کب میری دنیا کی پرواہ کی تھی جسے میں چاھتا تھا آپ اسی کے حال پر چھوڑدیں، ہر طرح کی گندگی سے پاک لیکن آپ نے اُسے دھویں، نابکاری، نابکار راکھ اور اپنے تجربات سے تباہ کرکے رکھدیا۔ میرا اسکول، میرا گاؤں، میرے دونوں لڑکے سب کہاں ہیں؟ سب آپکی نذر ہوگئے۔ جتنے کی آپکو ضرورت نہیں تھی اُس سے زیادہ کی آپ کو ہوس تھی۔ اپنے سمندروں اور پہاڑوں تک کو نہیں چھوڑا۔ اُن میں بھی دشمن کی حرکات کو سونگھ لینے والے ایٹمی آلات نصب کئے۔ کیوں میں اپنی بیوی یا خود کو انسان کی بقا کیلئے استعمال ہونے دوں۔ اور یوں بھی دیکھا جائے تو انسان کی بقا کی آپ‌کو کب فکر رہی ہے"۔

باہر سے آنے والے برابر اپنی حکومتوں سے وائرلیس پر صلاح مشورہ لے رہے تھے اور لمحہ لمحہ کی خبر بھی دے رہے تھے۔ اُنہیں پتہ چلا کہ ماسٹر کی بیوی بیمار ہے اور وہ خوشی سے اچھل پڑے کیونکہ اسکی بیماری کا علاج انکے پاس تھا۔ لیکن ماسٹر نے وہ دوا لینے سے بھی انکار کردیا۔

دن گذرا۔

آنے والے پہاڑی پر رات بسر کرنے کا اہتمام کرنے لگے۔ گاہے گاہے انکے پاس عجیب و غریب قسم کے پیغامات آتے تھے۔ مثلاً، جو خلا نورد کسی دوسرے سیارے پر بھیجے جا رہے تھے انہوں نے روانہ ہونے سے پہلے پوچھا

"عورت راضی ہوئی؟"

مواصلاتی سیارے کے ذریعے جو کرکٹ کمنٹری ہو رہی تھی اور جسے کچھ لوگ خاصے انہماک سے سن رہے تھے ایکدم رک گئی اور کسی نے مائیک کے پاس منہ لاکر کمنٹری کرنے والے سے کہا "شٹ اپ، مجھے بات کرنے دو۔ عورت راضی ہوئی؟" اور یہ بتائے جانے پر کہ 'نہیں' اسنے تھینک یو کر کے مائیک دوبارہ کمنٹری کرنے والے کے حوالے کردیا۔

چند روز میں پہاڑی پر مختلف ممالک کے لوگوں کی ایک اچھی خاصی آبادی ہوگئی۔ جسکا کام باقی دنیا کو محض اس عورت کا حال بتانا اور اسکے شوہر کے فیصلے سے آگاہ کرنا تھا۔ عورت کی حالت تیزی سے بگڑ رہی تھی اور وہ اور اسکا شوہر غار چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔

باہر مختلف ممالک کے نمائندوں میں بحث چھڑ جاتی تھی کہ اس تباہی کا ذمہ دار کون تھا۔ جینیٹکس کے تجربوں کا آغاز کس نے کیا تھا۔

ایک چھوٹے ملک کے نمائندے نے فخر سے کہا "خدا کا شکر ہے پہل ہم نے نہیں کی تھی۔ ہم مشرقی ممالک کے لوگوں میں ابھی تک روحانی قدریں باقی ہیں"۔

ایک عظیم طاقت کے نمائندے نے دانت کچکچاکر اسکی طرف دیکھا اور کہا "کیسے بہلا رہے ہو۔ دوسروں کو یا خود کو۔ تم ہمیشہ اپنے پڑوسی ملک کو برباد کرنا چاہتے تھے جو تمہارا ہی جتنا روحانی اقدار کا مالک اور تمہارا ہی جتنا مشرقی تھا"۔

ایک سیاہ فام نمائندے نے کہا "ہم نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا ہم ہمیشہ اپنے دشمن کو تیر کمان اور بھالوں سے ختم کرسکتے تھے"۔

"تم نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا؟ تم وہ چھوٹے چھوٹے فتنے تھے جو ہمیشہ ہم سے کہتے تھے 'جاگو ورنہ دوسری عظیم طاقت پوری دنیا کو ہڑپ کر جائے گی'۔ تم اسلحہ کی بھیک مانگنے کس دروازے پر نہیں گئے ہو۔ تم اور تمہاری روحانی اقدار اور مشرقیت! یہ اقدار تھیں یا جھوٹے اعتقادات؟"

جب وہ لوگ آپس میں لڑ رہے تھے اسکول ماسٹر غار سے باہر نکلا اور کھال کا پردہ کھینچ کر اُسے غار کے منہ پر سے ہٹا دیا۔ عورت غار کے اندر کھالوں کے ڈھیر پر لیٹی ہوئی تھی۔ ماسٹر دوبارہ اندر گیا اور جب وہ باہر آیا تو اسکے ہاتھ میں ایک پھاوڑا تھا۔ غار سے تھوڑے فاصلے پر وہ زمین کھودنے لگا۔

مواصلاتی سیارے کے ذریعے کسی نے خلائی تجرباتی سینٹر سے پوچھا "کوئی خبر؟"

وائرلیس آپریٹر نے کہا "میرا خیال ہے وہ عورت رات مر گئی"۔

دوسری طرف تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر سوال کرنے والے نے بیوقوفی سے پوچھا۔ "یعنی دوا لینے پر راضی نہیں ہوئی"۔

وائرلیس آپریٹر نے ترشی سے کہا "ظاہر ہے"۔

اسکول ماسٹر جو گڑھا کھود رہا تھا اب اسکی شکل واضح ہو چکی تھی۔ گڑھا تقریباً ٦ فٹ لمبا تھا اندر عورت اسی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی۔ ایکبار پھر مواصلاتی سیارے کے ذریعے خلائی تجرباتی سینٹر سے کسی نے پوچھا "تمہیں یقین ہے عورت مر چکی ہے؟"۔

آپریٹر نے کہا "بالکل"۔

Scanned by CamScanner

سوال کرنے والے نے پوچھا "نئی دوا کا کیا کرو گے؟"۔

"معلوم نہیں۔ ابھی سوچا نہیں ہے"۔ ادارہ انسان کو بچاؤ کے نمائندے نے کہا۔

دوسری طرف والے نے کہا "ہمیں بھیج دو"۔

"کیوں؟" عالمی ادارہ 'انسان کو بچاؤ' کے نمائندے نے پوچھا۔

"ہمیں معلوم ہے اسکا کیا کرنا چاہئے" خلائی تجربہ گاہ کے سوال کرنے والے نے کہا۔

ادھر خاموشی رہی۔

خلائی تجربہ گاہ والے نے کہا "ہم خلاء میں جانے والے راکٹ کی ناک کے کیپسول میں رکھکر اسے بھی خلاء میں بھیج دیں گے"۔

اسکول ماسٹر تھوڑے تھوڑے وقفے سے قبر کی مٹی پھاوڑے سے باہر پھینک رہا تھا۔ اسکے سر پر سے ہیلی کوپٹر گذر رہے تھے۔ لیکن وہ انکے پروں کے شور سے بے نیاز خود سے باتیں کر رہا تھا۔

"پیاری زمین، تو ابھی تک اچھی ہے۔
ابھی تک کتنی خوبصورت ہے۔ اتنی
خوبصورت کہ میں اپنی سب سے خوبصورت
متاع جسے میں نے تیرے ان دشمنوں کے
حوالے نہیں کیا، آج تیرے حوالے کرنے کو
تیار ہوں"۔

—

بپتا کی رات

اس دن، سارے دن ہمنے ماں کا انتظار کیا۔ لیکن نہ وہ خود گھر آئیں اور نہ ہی کسی سے اپنی خیریت کی خبر انہوں نے ہمیں کہلوائی۔

ہم میں سے بھی کسی کو گھر سے باہر قدم دھرنے کی ہمت نہیں ہوئی کیونکہ آج کل بازار سر شام بند ہو جاتے ہیں اور اگر کسی رات ایک یا دو دفعہ رائیفل چلنے کی آواز سنائی بھی دے جائے تو کسی کو تعجب نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ پڑوس کی بڑھیا اپنی بالکنی پر سے اپنا آدھا دھڑ باہر کو لٹکاتے ہوئے پکارتی ہے

"خانم! خانم! چہ شد؟"

اور ماں کے جواب پر کہ "ہیچ نشد" وہ واپس اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے اور دوبارہ سڑک پر خاموشی چھا جاتی ہے۔

اوپر آسمان وہی پرانا ہے اور گلیوں اور سڑکوں پر ہوا کے جھونکے اسی طرح رات کو چلتے ہیں لیکن آج کل ہوا میں آئیل ریفائینری کے میناروں میں جلنے والی گیس کی بوٗ نہیں ہوتی ہے یعنی بظاہر ہوا صاف ہے لیکن پھر بھی اس صاف ستھری ہوا سے کوئی خوش نہیں ہے۔ کچھ لوگ

کہتے ہیں اس مصنوئی ھوا سے تو وہ گیس اور کاروں کے چھوڑے ہوئے دھوئیں سے آلودہ ھوا ہی بہتر تھی۔ اس صاف ھوا کو جسے پھیپھڑے باوجود ضروری ھونے کے قبول نہیں کر رہے ہیں جس طرح بعض اوقات بھوک ہوتے ہوئے بھی کسی بیمار آدمی کا دل کھانا کھانے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے "کھانا واپس لوٹ کر منہہ کو آتا ہے"۔ لوگ کہتے ہیں یوں بھی دیکھا جائے تو ھوا اس وجہہ سے صاف ہے کہ آئیل ریفائینری بند پڑی ہے اور لوگ گھروں میں بیٹھے ہیں اور یہ خاموشی اور صفائی عارضی ہیں۔

اس دن ھم سب تقریباً بھوکے رہے۔ ہمیں معلوم تھا ضرور کچھ نہ کچھ ھوا ہے۔ ماں کے ملنے والے جنہیں بازرگان (تاجر)، وہ جنکی فروشگاھوں میں پرانے قیمتی قالینوں کی دوکانیں ہیں، پولیس والے اور ملٹری افسر سب ہی شامل ہیں کوئی بھی تو نہیں جھانکا حالانکہ انہیں ضرور کچھ نہ کچھ اس واقعہ کی سن گن ھوگی۔

لیکن آج کل سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ کوئی سوئیٹزرلینڈ اپنی رقم منتقل کر رھا ہے، کسی کا خاندان پہلے ہی یہاں سے بھاگ چکا ہے اور وہ خود سرحد پار کرنے کی فکر میں ہے۔ لیکن ھم لوگوں کے پاس نہ باہر بھیجنے کیلئے سونا ہے اور نہ ہی اتنی رقم کہ کسی طور یہاں سے بھاگ سکیں، کشتیوں سے، ڈھاؤ (عرب جہاز) سے، یا جیٹ سے۔ ھر چیز ھماری بساط سے باہر ہے اور جانے کے لئے جگہہ بھی کونسی ھے؟ ماں کا کہنا ہے
'ھمیں کون قبولے گا!'

یوں بھی دیکھا جائے تو پچھلے دو سال میں ھمارے گھر میں کتنی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ باہر کے ملکوں کے

سیلرز (ملّاح) اور ہوائی جہازوں پر کام کرنے والے اب ہمارے گھر کم آتے ہیں اور ملٹری والوں، تاجروں کے مراسم بھی اب ماں سے کم ہی رہ گئے ہیں۔ مکان کا کرایہ، جسمیں ہم رہتے ہیں، اتنا بڑھ گیا ہے کہ ماں کو خیال ہوتا ہے اب انکا آدھا بوجھ کوئی اور سنبھالے۔

ہم چار بہن بھائی ہیں — ۲ بہنیں، ۲ بھائی — لیکن غلطی سے بڑے دونوں بھائی ہیں اور بہنیں دونوں چھوٹی۔ ورنہ شاید مہمانوں کی ریل پیل آسی طرح رہتی جس طرح آج سے چند سال پہلے تھی۔

اب ہمارے پاس صرف دو کمرے ہیں۔ مہمان اس کمرے میں بیٹھے ہیں یا بیٹھتا ہے جو زیادہ سجا ہوا ہے۔ جسمیں کیسپین کے ساحل اور آن پر نہانے والی عورتوں کی بڑی بڑی تصویریں سنہری فریموں میں دیوار پر لگی ہیں اور سالوں سے ٹنگی رہنے کی وجہ سے بے جان سی لگنے لگی ہیں۔ لیکن شاید نئے مہمانوں کے لئے ہمیشہ انمیں دلکشی ہوتی ہوگی۔

یہ کمرہ جسے ہمارا آتاق پزیرائی سمجھنا چاھئے دن میں ہمارے استعمال میں بھی آتا ہے اور ہم اسکے صوفوں پر لیٹتے ہیں، کودتے ہیں۔ ہوا میں پھولوں اور سینٹ کی خوشبو ہوتی ہے۔ اسوقت کھڑکی کے پٹ کھول دیئے جاتے ہیں اور پردے ہوا میں لہریں سی بنا بناکر ہلتے رہتے ہیں۔

دوسرا کمرہ ہمارا اپنا، ہم چاروں بہن بھائیوں کا ہے۔ اسمیں بستر ہیں، ایک میز اور کرسی ہے، دیوار پر مولیٰ علی کی ایک اتنی ہی بڑی معمولی کاغذ پر چھپی ہوئی پوسٹر نما تصویر ہے جتنی برابر کے کمرے میں لگی ہوئی سب سے بڑی تصویر۔

اس کمرے میں ہوا کم آتی ہے۔ اور بستر بھی

معمولی قسم کے ہیں۔ قیمتی فرنیچر پچھلے چند سالوں میں آہستہ آہستہ بکتا رہا ہے اور اس کا ہمیں ہمیشہ قلق ہوتا ہے۔

رات کو یہ پورا علاقہ پہلے جگمگایا کرتا تھا۔ ہر کمرے میں سے اندھیرا ہوتے ہی روشنی پھوٹنے لگتی تھی اور کچھ عورتیں کھڑکیوں پر اس طرح آ کھڑی ہوتی تھیں جیسے اپنی ٹھوڑی اپنے ہاتھوں کے پیالے میں رکھے، کہنیاں کھڑکی کی دہلیز پر ٹیکے وہ نیچے کی چلتی پھرتی دنیا کو دیکھ رہی ہوں۔ بعض عورتیں، یا لڑکیاں بے اعتنائی سے دہلیز پر بیٹھی ہوئی نظر آتی تھیں اور انکی پیٹھ کھڑکی کے فریم سے ٹکی ہوتی تھی۔

کبھی کبھی خیابان سے گذرنے والا کوئی ملّاح اپنے نئے جاپانی کیمرے سے انکی تصویر ایکدم نیچے ہی سے کھینچ لیتا تھا اور کھڑکی میں فلیش کی روشنی آسمان کی بجلی کی طرح چمک کر گم ہو جاتی تھی۔ لڑکیاں مسکرا کر کبھی ہاتھ ہلا دیتی تھیں کبھی "چاو" یا کوئی اور لفظ کہہ دیتی تھیں۔ عرصہ ہوا ایک دفعہ ایک تصویر ہمنے ایک کتاب میں دیکھی تھی — کھُردری لکڑی کا کھڑکی کا فریم اور اسمیں سے جھانکتے ہوئے تین بچّے اور انکی بڑی بہن جسکے گلے میں سُرخ اسکارف تھا۔ یہ تصویریں بھی ویسی ہی لگتی ہونگی۔ لیکن کبھی کسی مہمان نے جسنے نیچے سے پہلے ماں کی تصویر کھنچی ہو اور بعد میں بلانے پر وہ اوپر آیا ہو واپس جاکر ہمیں تصویر کی ایک بھی کاپی نہیں بھیجی۔ لیکن ماں اسکے باوجود ہمیشہ ہر ایک کی تصویر کے لئے مسکرائیں جس طرح اور لڑکیاں یا عورتیں مسکراتی ہیں۔

وہ سارا دن گذر گیا۔ پھر شام ہوئی اور آہستہ آہستہ

رات بڑھنے لگی۔ ہر طرف خاموشی تھی اور اس ماحول سے ہم چاروں اکتائے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس نہ پیپسی پینے کیلئے دام تھے نہ ہی بازار سے جاکر بھیڑ کا گوشت اور نان خریدنے کیلئے۔ بھیڑ کا گوشت اس وجہ سے کیونکہ وہ سب سے ارزاں ہوتا ہے — ایک سیخ پر ایک بوٹی، ایک پیاز یا ٹماٹر کا ٹکڑا، پھر ایک بوٹی پھر ایک پیاز یا ٹماٹر کا ٹکڑا، اسی طرح تین چار بوٹیاں لگی ہوتی ہیں اور حالانکہ انمیں سے ایک خاص قسم کی بوُ آتی ہے جو اچھے ریستورانوں سے آنے والے کبابوں میں نہیں ہوتی ہے لیکن پھر بھی ہم بھوک میں ان ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور ناک بھوں نہیں چڑھاتے۔ ماں نے ہمیشہ اس معاملے میں ہماری تعریف کی ہے۔ کبھی کبھی جب کوئی مہمان برابر کے کمرے میں جسمیں کیسپئین کے ساحل کی تصویریں ہیں اپنی وھسکی پیتے بیٹھتا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ بیٹھتا تھا اور بازار سے چلو کباب اور پلاؤ اپنے اور ماں کیلئے منگواتا تھا تو وہ بہانے سے آدھی سے زیادہ اپنے حصّے کی پلیٹ ہمارے کمرے میں چھوڑ جاتی تھیں اور جاتے جاتے سرگوشی میں ہم سے کہتی تھیں "لڑنا مت"۔

لیکن اس رات ہم پل بھر بھی نہ سو سکے۔ کھڑکی پر کھڑے کھڑے ہمارے پیر دکھنے لگے۔ پیچھے کے گلیارے میں جہاں پہلے اندھیرے میں عورتیں میک آپ کئے ادھر ادھر رات گئے تک ٹہلتی رہتی تھیں یا نیم روشن دروازوں میں کھڑی کبھی کبھی اپنے بلاؤز اٹھاکر انمیں پھونک مارتی نظر آتی تھیں قبرستان کا سا سناٹا تھا۔ بڑی سڑک پر ایک آدھ ملٹری وھیکل گھنٹے دو گھنٹے میں گذر جاتی تھی۔

شکر ہے اس رات گولی چلنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ ہمارے پیٹ خالی تھے، دل ماں کے خوف سے دھکر پکر

کر رہے تھے کہ کہاں ہیں کس حال میں ہیں، آنکھیں نیند سے جل رہی تھیں اور ٹانگیں دکھ رہی تھیں۔

اس طرح وہ رات گذر گئی اور صبح جب پو پھٹے ہمنے ماں کو لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سامنے کا موڑ مڑ کر اپنی سڑک پر آتے دیکھا تو ہم میں سے جو دو بڑے ہیں دم بخود رہ گئے۔ ایک کی چیخ نکل گئی۔ اور ایک بیہوش ہوگئی۔ کیونکہ ماں کی تصویر بڑی بھیانک تھی۔

نجانے کس طاقت سے وہ دروازے تک چل کر پہنچیں اور جس طرح چابی یا بیٹری ختم ہوجانے پر کھلونے ایک دم رک جاتے ہیں وہ ہماری ساختمان کے دروازے پر پہنچ کر ڈھیر ہوگئیں۔

ہم بھاگتے ہوئے نیچے پہنچے، کچھ عورتیں بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل آئیں اور انہوں نے ماں کو پہلے تو پانی کے چھینٹے دیکر ہوش میں لانا چاہا اور جب وہ کراہیں تو انہیں سہارا دیکر کھڑا کرنے لگیں۔ لیکن جب ماں سے کھڑا نہیں ہوا گیا تو انہوں نے انہیں اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور اوپر لے چلیں۔ ہم خاموشی سے انکے پیچھے پیچھے تھے جیسے لوگ جنازے میں چلا کرتے ہیں۔

ماں کو آسی اتاق پزیرائی میں بڑے صوفے پر لٹا دیا گیا۔

ایک عورت نے کہا "گھر میں وھسکی یا برانڈی کچھ ہے؟"

ایک دوسری عورت نے طنزاً کہا "کیسے ہو سکتی ہے! ڈھونڈھنا بھی فضول ہے۔ جو بچی کُچھی کسی کے پاس تھی آسے ابھی پرسوں ہی تو سجہ اور قبا والے چھاپے مار کر لے گئے ہیں"۔

پڑوس کی بڑھیا جو ماں کے ہونٹوں پر پیار اور ہمدردی سے پانی میں تر کیا ہوا رومال بار بار پھیر رہی تھی اپنے

Scanned by CamScanner

گھٹنوں پر ہاتھ رکھکر بڑی مشکل سے اٹھکر کھڑی ہوئی کیونکہ اسکے گھٹنوں اور کولھوں میں رھیومیٹزم بتایا جاتا ہے۔ سب نے اسکے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنے فلیٹ سے واپس آئی تو اسکے ھاتھ میں رومال میں لپٹی ہوئی ایک سینٹ کی شیشی تھی۔ عورتوں کے چہروں پر ھلکی سی مسکراھٹ پیدا ہوئی — ہیرزن سمجھ کر شاید اسکے گھر پر چھاپا نہیں مارا گیا تھا۔

بڑھیا دوبارہ ماں کے پاس قالین پر بیٹھ گئی۔ پانی کا جو گلاس ماں کے پاس جیوں کا تیوں پڑا تھا اسمیں اس نے شیشی میں سے چند چمچے برانڈی کے میلائے اور ماں سے پینے کیلئے کہا۔

برانڈی پینے کے بعد جیسے ماں کا سکتہ ٹوٹ گیا وہ لڑکھڑاتی ہوئی ھماری طرف کو بڑھنے کیلئے اٹھیں لیکن دھم سے دوبارہ صوفے پر گر گئیں۔ ہم دوڑ کر آنسے لپٹ گئے اور وہ ھمیں بھینچ بھینچ کر رونے لگیں۔ انکا بین سنکر کچھ عورتوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ انہیں پونچھتی ہوئی وہاں سے سرکنے لگیں۔

ماں کو اپنی پیٹھ کے زخموں کی پرواہ نہیں تھی جس پر کوڑوں کی بدھیاں پڑ گئی تھیں اور جگہہ جگہہ سے کھال پھٹ گئی تھی۔ کہیں کہیں سوکھے ہوئے خون کے ساتھ ساتھ قمیص بھی بدن پر چپک گئی تھی جسے اب پانی سے گیلا کرکے علیحدہ کیا جا رہا تھا۔ زخم کی کوئی کوئی سیدھی باریک لکیر پیٹھ پر سے ہوتی ہوئی چھاتیوں تک پہنچ گئی تھی جیسے چمڑے کا کوڑا کوئی سانپ تھا جس نے بار بار انکی پیٹھ پر پھن مارے ہوں اور ایک آدھ بار کمر کے گرد لپٹ کر اسکا پھن انکے دودھوں تک پہنچ گیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد عورتیں کھسر پسر کرتی ہوئی وہاں سے

رخصت ہونے لگیں۔ ماں کے بین کو سنکر کسی نے ہم سے یہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا کہ ہم نے کل دن میں کیا کھایا تھا اور رات کیا کھاکر سوئے تھے۔

جب ماں کو مع اس مہمان کے جو باہر کے کسی شہر سے یہاں آیا ہوا تھا چھاپہ مارکر سبحہ اور قبا والے — جیساکہ دولت (حکومت) کے ان نئے کارکنوں کو کہا جاتا ہے — صبح صبح پولیس وان میں کہیں لیجایا جا رہا تھا تو ہر عورت نے گھبراکر اپنے گھر کے دروازے اور دریچے بندکر لئے تھے۔ دن بھر سوائے ہمارے گھر کی کھڑکی کے ہر دروازہ بند رہا تھا اور دہشت نے پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

اب ماں کے واپس آجانے پر جیسے سب نے وقتی طور پر اطمینان کا سانس لیا تھا یعنی اس وقت تک کیلئے جب کوئی دوسری عورت اسی طرح پولیس وان میں کسی انجانی جگہہ لیجائی جائے اور اسی حال میں ۲۴ (چوبیس) گھنٹے بعد وہ دوبارہ گرتی پڑتی گھر کو واپس لوٹے۔

۲

وہاں ٹریبیونل کے سامنے مجھہ سے ایسے سوال کئے گئے جنمیں سے اکثر میری سمجھہ سے باہر تھے۔ مثلاً قوانین اور شرع کے بارے میں۔ میں کہنا چاہتی تھی مجھے یہ سب کچھہ نہیں پڑھایا گیا تھا اور جہاں میں پلی بڑھی اس علاقے میں نہ کوئی دانشکدہ تھا نہ دانشگاہ، نہ کتب خانہ، نہ خانۂ فرہنگ۔

وهاں پڑھے لکھے اور مذهبی غیر مذهبی انسان صرف آنے جانے تھے۔ ٹھیرنے اور بسنے کیلئے نہیں محض مہمان کی حیثیت سے اور انمیں سے بعض جو هماری زبان سے واقف نہیں ہوتے تھے، یعنی دوسری کیشوروں سے آنے والے، ایسے جملوں میں اوپر آنے کا 'سیدھا راستہ' پوچھتے تھے جو هم جیسے جاهل بھی جانتے تھے انہوں نے دینی مدارس میں بچپن میں پڑھے یا رٹے هونگے۔

لیکن اب وہ اس دور داروگیر میں اپنے گھروں میں سکون سے بیٹھے هم پر هنستے هونگے۔ تعجب یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ یہ علاقہ جب بھی بنایا گیا هوگا صرف آکے چلے جانے والوں کیلئے بنایا گیا هوگا اور یہاں کوئی آکے رہ نہیں پڑتا تھا پھر بھی یہاں کی آبادی برابر بڑھتی رهی۔ یہ لڑکیاں پھر کون تھیں؟ آسمان کی بیٹیاں؟

لیکن میں خاموش رهی کیونکہ سخندانی کے فن کی همیں تربیت نہیں دی گئی تھی۔

یہ جگہہ جو کچھہ بھی تھی کوئی کلانتری (پولیس اسٹیشن)، ملٹری بیرک، یا کسی سابقہ محل کا کوئی بڑا کمرہ، بری طرح خاموشی میں ڈوبی هوئی تھی ایسی خاموشی جسمیں بھاری بوٹوں کی آوازیں گونجتی هیں اور دور سے گذرنے والی هر کار کی آواز جیسے اپنا علیحدہ تاثر رکھتی ہے، کسی مجموعی شور کا نہیں۔ میرے سامنے کی دیواروں پر نئے انقلاب کے نعرے سفید کورے کپڑوں پر لکھہ کر میخوں سے ٹھونک دیئے گئے تھے اور ان سفید کپڑوں پر اس بے رحمی کی وجہہ سے دیواروں سے نکل کر جھڑنے والی سرخی کی دھول کی لکیریں بنگئی تھیں۔ مجھے محسوس هوا یہ میخیں بڑے بے ڈھنگے پن سے دیواروں میں گاڑھی گئی ہیں۔

ادھر ادھر "سیگار نکشید" کے چھوٹے بورڈ بھی

چوبی اسٹینڈز پر کھڑے تھے اور ٹریبیونل کے افراد کے سامنے بیٹھا ہوا ماشین نویس مجھ سے پہلے کے مقدمے کے کاغذات کی نقل ماشین تحریر پر بیٹھا ٹھک ٹھک کر رہا تھا۔ اسے مجھ میں اور میرے مقدمے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور شاید اس پہلے مقدمے کے مقتولین میں بھی نہیں تھی جنکے کاغذات وہ اب مکمل کر رہا تھا۔ مجھے لگا اس انقلاب میں وہ شاید خود بھی ماشین بنکر رہ گیا تھا۔

البتہ جب ایک باریش ملٹری افسر نے مجھ سے میرا نام پوچھا تو میرے فاطمہ کہنے پر اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر بے دلی سے اپنی ٹھک میں مصروف ہو گیا۔

میرا دماغ اس وقت بے وجہ ادھر ادھر گھوم رہا تھا جیسے نہ مجھے اس وقت اپنے مہمان میں دلچسپی تھی جو عدالت میں ــ یا اس جگہ کا جو کچھ بھی نام ہو سکتا تھا ــ ایک طرف خوف زدہ کھڑا تھا (جیسے اس نے وہاں کوئی آسیب دیکھ لیا ہو)، نہ اپنے چار بچوں میں جنکے صبح کے کھانے کا انتظام کئے بغیر مجھے یہاں لے آیا گیا تھا۔

یہ سوال میں بارہا اپنے آپ سے پوچھ چکی تھی کہ میری کوئی مرضی ہے یا مجھے بغیر مرضی عطا کئے ہوئے خدا تشکیل کر بیٹھا ہے!

نہ میرے لئے اور میرے آسمان سے اترے ہوئے بچوں کیلئے دنیا میں کوئی جگہ تھی اور نہ ہی مجھے اور ہمیں کھلانے کی ذمہ داری کسی پر عائد ہوتی تھی۔ 'بشمول خدا؟' میرے دماغ میں جیسے کیڑے سے کوئی کیڑا کبھی اٹھتا تھا اور میں اسے لالاکر کے سلانے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن چونکہ عدالت کا فیصلہ میں سربازوں کی سرگوشی میں جو ہمیں گرفتار کرکے یہاں لائے تھے تقریباً سن ہی چکی تھی

Scanned by CamScanner

اسلئے میرا دماغ سُن ہوگیا تھا۔ اور جیسا کہ میں کہہ آئی ہوں خاموشی میں ہر آواز اپنا علیحدہ تاثر رکھتی ہے اسی طرح یہ 'بشمول خدا؟' والی آواز بھی مجھے میری مرضی کے خلاف دماغ کے اندر سے بار بار سُنائی دیتی تھی۔

میرا علاقہ جہاں میں رہتی ہوں وہاں رہنے والی ہر عورت اور لڑکی کا چہرہ رات کو ایک ہی جیسا دکھائی دیتا تھا۔

بھڑکیلے لباس والی لڑکیاں جنکے بھورے سنہری بال انکی گردنوں پر سے ہوتے ہوئے ننگے کندھوں پر آبشاروں کی طرح گرتے تھے اور چہرے پر ایک بھی شکن نہیں ہوتی تھی —— نہ عمر کی نہ فکر کی —— سر شام بن سنور کر کھڑکیوں میں اس طرح آبیٹھتی تھیں جیسے وہ اُن کتابوں میں کا کوئی عکس ہوں جو اکثر غیر ملکی مہمان اپنے ہمراہ شب بسری کے وقت ہمارے یہاں لے آتے تھے۔ مجھے تھوڑی بہت جرمن بھی آتی ہے، فرانسوی بھی اور انگلش بھی اور مینے ان لڑکوں کو ہنس ہنس کر وہ کتابیں ہمارے چہروں کے سامنے کھول کر ہوا میں لہراتے بھی دیکھا ہے۔

"Like you, eh?"

یعنی تصویر والی شکل مجھ سے اور اُن لڑکیوں سے مشابہت رکھتی تھی اور ایک مرتبہ جب ایک لڑکے نے چار زبانوں میں چھپی ہوئی اس کتاب کا ایک صفحہ کھول کر میرے چہرے کے آگے لہراتے ہوئے کہا "او مَرکھے یام" تو اسکے ساتھی نے بیک وقت اس سے اور مجھ سے آدھا آدھا جملہ کہا "تمام لڑکیاں یہاں اومرکھے یام ہیں —— سی ھی لائیک یولائیک اومرکھے یام" (دیکھا تم بھی اسکے عمرخیام جیسی نظر آتی ہو)۔

اسوقت ٹریبیونل کے سامنے کھڑے کھڑے وہ تصویریں میری نظروں کے سامنے گھوم گئیں۔ گھونگریالے بالوں والی لڑکیاں، انکی کنپٹیوں کی سمت اٹھی ہوئی بھنوؤں کی تحریریں جیسے ہوا میں پرتول رہی ہوں اور انہی کی وجہ سے ان چہروں میں ایک شان تمکنت پیدا ہو گئی ہو۔ انکے جھلمی اوپر کے کپڑوں میں سے نظر آنے والی چھاتیاں جیسے سفید پتھر کو چھینی سے چھیل کر بنائی گئی ہوں۔ اور ان رنگین تصویروں کے نچلے حصوں میں نظر آنے والے بوڑھے اور جوان چہرے۔ داڑھی والے بوڑھوں کے ہاتھوں میں شراب کے پیالے ہوتے تھے اور وہ ان کم عمر، بہت ہی کم عمر حسین لڑکیوں سے ــــ جنکے چہرے ایک جیسے ہوتے تھے ــــ جیسے ملتجیانہ کچھ طلب کر رہے ہوں۔ زندگی؟ فرار؟ نجات؟ کون جانے کیا۔

لیکن اس وقت وہی داڑھی والے چہرے میرے سامنے بیٹھے تھے۔ انمیں سے کچھ دوپہر کے کھانے کے ریزے اپنے دانتوں میں سے کُرید کُرید کر نکال رہے تھے اور کچھ ہم دونوں سے بے نیاز آپسمیں کھسر پھسر کر رہے تھے۔

حالانکہ میرے لئے یہ وہ وقت تھا جب ہم میں سے ہر ایک کا چہرہ اپنا اپنا ہوتا ہے۔ ہر کوئی تھکی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور سیاہ تحریر مٹ جانے سے وہ بھنویں شکن آلود چہروں پر بچے کھچے بالوں کی ریت میں سے جھانکتی ہوئی جھاڑیوں کی طرح نظر آتی ہیں ــ اسوقت خیابانوں پر سے گذرنے والوں کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ نہ وہ بازرگان کہیں نظر آتے ہیں، نہ فروشگاہوں کے مالک اور سونے اور تریاک کے بیوپاری ــ باعزت لوگوں کی جگہہ ہما شمالے لیتے ہیں ــ لانڈری والے، ترکاری والے اور زندگی کی مادّی ضروریات پوری کرنے والے ــ اور اب کچھ عرصہ

سے آن لوگوں نے بھی ادھر سے گذرنا کم کردیا تھا۔ بہت سی عورتیں یہاں سے غائب کردی گئی تھیں یعنی کہیں لیجائی تو گئی تھیں لیکن لوٹ کر واپس نہیں آئی تھیں اور انکے گھروں میں اول تو مرد تھے ہی نہیں جو جاکر کسی اہم آدمی سے انکے بارے میں پوچھ گچھ کرتے اور جو تھے بھی وہ گولی مار دیئے جانے کے تصور سے گھر سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کیونکہ وہاں شاید آن سے سوال ہوتا۔

"تم فلاں پری کے شریک کار ہو؟"

اور وہ چاھے لاکھ اپنی صفائی میں کچھ کہتے مثلاً "ھمنے دنیا کو اسی طرح پایا تھا" لیکن چونکہ حکومت کے پاس انکے لیئے کوئی دوسرا پروگرام یا دوسری قسم کی دنیا کا تصور نہیں تھا اسلئے جب وہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ رہے ہوتے تھے انہیں دیوار کے پاس لیجاکر کھڑا کردیا جاتا تھا۔ شاید اسی عمارت کے احاطے میں کسی جاگہ— پھر بھاری بوٹوں کی دھپ دھپ سنائی دیتی اور امریکی رائیفلوں کے لوڈ کرنے کی آواز، چند بے معنی الفاظ— سپاھیوں کے، انکو حکم دینے والے کے، پیر پٹخنے کے، رحم کی بھیک کے، خدا کے مختلف نام۔ اور پھر دھماکہ اور خاموشی۔

میرے بڑے لڑکے کا ایک دوست ہے جسکا باپ ٹیکسی چلاتا ہے اور جسکی ٹیکسی میں گود میں عیسیٰ کو لئیے ہوئے مریم کی تصویر فیشیا بورڈ پر عین اسکے سامنے لگی ہے کیونکہ وہ لوگ عیسائی ہیں۔ ایک آدھ بار اسکی ٹیکسی میں میں بھی بیٹھی ہوں اور اس تصویر پر بھی میری نظر پڑی ہے۔ کبھی کبھی تصادم بچ جانے پر مینے اسے سینے پر صلیب کا نشان بناتے بھی دیکھا ہے۔ ایک دن میرے لڑکے نے مجھے بتایا اسکا وہ دوست ان چند ھفتوں میں بالکل بدل گیا ہے اور اسنے میرے بیٹے سے کہا وہ لوگ یہاں سے بد دل ہوگئے

ہیں اور کسی اور کشور کو سدھارنا چاہتے ہیں کیونکہ اسکے باپ کے خیال میں ہمارے لوگ یعنی وہ جو عیسائی نہیں تھے ایکا ایکی بدل گئے تھے اور اسکے باپ کو مختلف قسم کے خوفوں نے آن دبایا تھا مثلاً کوڑوں کا خوف، ایک دن دیوار کے ساتھ کھڑا کرکے گولی مار دئیے جانے کا خوف اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کہیں خود اسکی اولاد آہستہ آہستہ اسی رنگ میں نہ رنگ جائے۔ وہ لوگ شاید ان گنت صدیوں سے اسی ملک میں رہتے آئے ہیں لیکن یہ خوف پہلے تو اسے نہیں تھا کہ اسکی اولاد کہیں اپنا مذہب چھوڑ کر ہمارا مذہب نہ اپنالے۔ یقیناً وہ اکثریت کے مذہب سے نہیں اسکی خارجی شکل سے خائف تھا جو اسکی اولاد کو بجائے مذہب کے، تشدّد کی تعلیم دے سکتی تھی — اور کچھ نہیں۔

۴

آؤ اے روحو!
مجھے بے جنس کردو
اور سر سے لیکر پیر تک مجھ میں
انتہائی بے رحمی بھر دو

ولیم شیکسپیئر (میکبیتھ)

شام تک میرے سابقہ مہمان کی حالت دگرگوں ہوچکی تھی اور میں خالی الذھن ایک بینچ پر بیٹھی تھی۔ ھمیں نہ

Scanned by CamScanner

صبح کا ناشتہ نصیب ہوا تھا، نہ دوپہر کا کھانا اور نہ ہی شام کی چائے۔

ٹریبیونل کے افراد دن بھر بدلتے رہے انمیں سے اکثر کے چہرے داڑھیوں سے مرصع تھے اور یہ وہی لوگ تھے جنہیں آج کل سبجہ اور قبا والے کہا جاتا ہے۔ میری بینچ ہال کے پچھلے حصّے میں تھی جہاں سے میں پورے ماحول کا جائزہ بھی لے سکتی تھی اور ہر آنے جانے والے کو بھی دیکھ سکتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بھاگتا ہوا کمرے میں ایک طرف سے داخل ہوتا تھا جیسے ہال کو پار کر رہا ہو اور ٹریبیونل کے ڈائس کے سامنے سے گذرتے ہوئے وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر تعظیم سے سر جھکاتا ہوا تقریباً اسی رفتار سے دوسری طرف کے دروازے سے باہر نکل جاتا تھا۔ دن میں دو ایک بار گولی چلنے کی آواز آئی جسے سنکر میرا سابقہ مہمان دہشت سے کانپ اٹھا۔ اسمیں اور مجھ میں خاصا فاصلہ تھا ورنہ شاید ہم آپس میں باتیں کرکے ہی یہ بھوک پیاس کا دن گذار دیتے۔

مینے کئی بار کوشش کی کسی گذرنے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کراؤں لیکن ایسا لگتا تھا وہ لوگ نہیں مشینیں تھیں جو ہر قسم کے جذبات سے عاری اپنے کام میں مصروف تھیں۔ انہیں مذہبی مشینیں بھی کہا جاسکتا تھا۔

تقریباً اس وقت جب شام کا اندھیرا باہر کھڑکیوں میں سے ہمیں نظر آنے لگا تھا مجھے فاقے کی نیم بیہوشی سے کسی نے جھنجھوڑ کر آگے آنے کیلئے کہا۔ یعنی یہ کہ اب ہماری باری تھی۔

میرا ساتھی چلایا۔ ”نہیں۔ نہیں۔ خدا کیلئے۔۔۔“

لیکن سپاہیوں نے اسے ڈائس کے نزدیک آنے کا حکم دوبارہ دیا۔

مجھے تعجب ہوا اس کمرے میں جہاں صبح سے میں مرد ہی مرد دیکھ رہی تھی ایک اور عورت نجانے کب داخل ہوئی تھی اور اب وہ بھی ٹریبیونل والوں کے بائیں ہاتھ پر مؤدبانہ کھڑی تھی۔

مجھ پر غفلت طاری تھی اور خوف جیسے نچڑ کر آج کے دن کے سفر میں کہیں پیچھے ہی رہ گیا تھا۔

ایک سبحہ اور قبا والے نے وہی صبح والے سوالات مجھ سے دوبارہ پوچھے

"تمہیں معلوم ہے اس جرم کی سزا کیا ہے؟"

میں خاموش رہی۔

اس نے یہی سوال میرے سابقہ مہمان سے کیا جو خاموش نہ رہ سکا اور بے وجہ اور بغیر کسی امید کے رحم کا سوال کر بیٹھا۔

اس وقت کے سبحہ اور قبا والے شاید وہ نہیں تھے جنہوں نے یہی سوالات مجھ سے آج ہی صبح کئے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہوں وہ ہی لیکن مختلف لوگوں کو سزائیں دیتے دیتے وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھے تھے اور انہیں ہم دونوں کے چہرے تو کیا اس کمرے میں ہماری موجودگی تک بھول چکی تھی۔

میرے سامنے کھڑی ہوئی عورت تقریباً میری ہی عمر کی تھی اور اس نے کسی خاص قسم کی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ پتہ نہیں اسکے بھی بچے تھے یا نہیں اور اگر تھے تو کیا وہ بھی انہیں میری ہی طرح گھر پر اکیلا چھوڑ کر

Scanned by CamScanner

یہاں آئی تھی؟ اسوقت مجھے اپنے مہمان سے زیادہ اس میں دلچسپی بلکہ اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔ ممکن ہے اسکا شوہر گھر پر ہو اور اسکی غیر موجودگی میں بچے نہ اکیلے رہے ہوں نہ بھوکے۔

مجھ سے سوال کیا گیا "تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہے؟"

مینے مؤدبانہ کہا "جو آپکے علم میں ہے"

ٹریبونل کے افراد میں سے ایک نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور کہا "یہ مت بھولو تم اسوقت ایک عدالت کے سامنے کھڑی ہو اور تمہارا ہر لفظ تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف جا سکتا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

ٹریبونل کے ایک اور فرد نے مجھ سے پوچھا

"تمہاری کفالت کون کرتا ہے؟"

"میں خود"

"اور اس کفالت میں شریک کون ہوتا ہے؟ میرا مطلب ہے تمہارا فرضی شوہر کون ہے؟"

میں کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر مینے کہا

"میرے چار بچے ہیں"

"اسکی تفصیل ہمارے پاس موجود ہے" انہی میں سے کسی ایک نے کہا۔

مجھے خوف محسوس ہوا یہ لوگ میری غیر حاضری میں میرے گھر تو نہیں گئے تھے اور یہی سوال مینے ان سے گھبرا کر پوچھا۔

Scanned by CamScanner

ٹریبیونل کے تمام افراد کے چہروں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔

پھر انہیں سے ایک نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا

"انکا باپ کون ہے؟"

دوسرے نے اسکی بات کی تصحیح کرنے والے لہجے میں کہا۔

"انکے باپ کون ہیں؟"

مینے چاہا واقعی اپنے چاروں بچوں کے باپوں کے نام گنا دوں کیونکہ میں ان سب کو جانتی تھی۔ لیکن اس کا فائدہ ہی کیا تھا۔ وہ کسی نظر نہ آنے والی رسیمان سے آج تک مجھ سے بندھے ہوئے تھے اور انہیں یہاں کھینچ کھینچ کر بلالینا اس وقت میرے بس میں تھا۔ لیکن خود جس اذیت سے آج میں گذر رہی تھی وہ میں کسی کیلئے بھی روا رکھنے کو تیار نہیں ہوتی۔

پھر مینے کہا "سب آسمان سے آئے ہیں"

ان لوگوں نے مجھے ڈانٹ کر خاموش ہو جانے کو کہا۔ انکے خیال میں میں اس درجہ پستی کو پہنچ چکی تھی جہاں مجھ سے کسی بھی اچھائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی اور یہ کہ میں اپنی عصمت تو کیا نسوانیت تک کھو چکی تھی۔

میرے اس آخری جملے کے دو ہی لمحے بعد ٹریبیونل نے اپنا فیصلہ سنا دیا جسمیں شرع اور مذہبی قوانین کے

حوالوں سے انہوں نے مجھے چالیس اور میرے مہمان کو پچاس کوڑوں کی سزا دی تھی۔ اور جو رقم میری قمیص سے برآمد ہوئی تھی اسے گناہ کی آمدنی کہہ کر ضبط کرلیا گیا تھا۔

میںنے اپناگاڑھا بچا کُھچا تھوک نگلا لیکن میرا ساتھی نیم بیہوشی کی حالت میں زمین پر گر پڑا۔

پھر دو سپاھی ھال کے پچھلے حصّے میں گئے جہاں مینے آجکا دن گذارا تھا اور اسی بینچ کو اٹھاکر وھاں لے آئے جہاں اب میں کھڑی تھی۔ یہی عمل اس بینچ کے ساتھ کیا گیا جس پر میرے ساتھی نے رو رو کر دن گذارا تھا۔

پھر ایک سبجہ اور قبا والے کے اشارے پر وہی عورت میرے پاس آئی اور اسنے مجھے پیٹ کے بل بینچ پر لیٹ جانے کو کہا۔

مجھے اسکا پیشہ کچھہ عجیب سا لگا۔

مینے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "اچھا تو تم ---"

اسنے کہا "ھاں"۔

مینے اس سے پوچھنا چاھا تمھارے بچے ھیں لیکن اسوقت تک میرے ھاتھہ پاؤں رسیوں سے کس کر بینچ کے چاروں پایوں سے باندھے جا چکے تھے اور وہ عورت جو اسی مذھبی مشین کا ایک پرزہ تھی جذبات سے عاری ایک چمڑے کا کوڑا سنبھالے میرے بائیں ھاتھہ پر کھڑی تھی۔

جب سزا ختم ہو چکی اور مجھے بینچ سے کھولا گیا

تو میرا ساتھی دوسری بینچ پر اپنی "سزا بھگتا کر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

* * * *

چند گھنٹوں بعد جب کھڑکیوں میں سے صبح کا دھندلکا اندر جھانکنے لگا تھا مجھے گھر جاکر آیندہ عزت کی زندگی گذارنے کی تلقین کی گئی۔

"تمہیں احساس ہوا کہ تم نے کیا گناہ کیا تھا؟"

مینے کہا "نہیں"۔

اس نے جھلا کر کہا "تم جیسوں کی سزا موت ہونی چاہئیے کیونکہ تم میں احساس جرم مر چکا ہے"

مینے کہا "آقا احساس جرم تو کیا مجھ میں آج نجانے کیا کیا کچھ مر چکا ہے۔ ویسے احساس جرم تو مجھ میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا"۔

اس نے تھپڑ مارنے کیلئے اپنا ہاتھ اٹھایا لیکن مینے اس ہمت سے کام لیتے ہوئے جو مرتے وقت ہر انسان میں کہیں سے ابھر آتی ہے اس سبحہ اور قبا والے سے کہا

"مجھے افسوس ہے"

اسکا ہاتھ رک گیا اور اس نے کہا "کس چیز کا؟"

مینے کہا "اس کام کا جو تم کر رہے ہو"

اسنے پوچھا "یعنی؟"

"یعنی یہی کہ جس طرح صدیوں میں دوسرے مردوں نے مجھے بدل ڈالا اور وہ نہیں بننے دیا جو مجھے ، ہر

عورت کو، بننا چاھئیے تھا اسی طرح تم نے اس عورت کی جنس بدل ڈالی ہے جسکا کام پنگورے کی ڈوری کھینچ کر لالا گانا تھا لیکن میری ھی طرح تمنے اسے بھی خرید لیا اور اسکے ھاتھ میں آج چمڑے کا کوڑا تھما دیا!"

❋ ❋ ❋

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق رابسجودے و نبی رابدرودے
غالب

---

* مہلت ہو اگر تجھکو تو جان اُس کو غنیمت، ساقی ہو مغنّی ہو مئے و نغمہ سرا ہو — جو لوگ کہ دیتے ہیں فریب اُن سے جدا رہ، سجدوں سے خدا کو تو درودوں سے نبی کو۔
— الیاس عشقی

Scanned by CamScanner

کانھا دیوی کا گھرانہ

میمن پاڑے میں ایک گھر کانہا دیوی کا بھی ہے۔ انکے آس پاس کے گھروں میں بھی ہندو رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے مسلمانوں کے گھروں کا ایک سمندر ہے اور اس میں سڑکوں، گلیوں کی کانٹ چھانٹ سے پیدا ہونے والی لکیروں کے بیچ میں ایک ٹاپو ہے جس پر یہ لوگ رہ رہے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ ہمیشہ ہی سے یہیں رہتے آئے ہیں۔ کبھی کبھی بھارت سے آنے والا انکا مائٹ دور سے آنے والی سمندر کی لہر کی طرح اس ٹاپو کو بھگوکر واپس لوٹ جاتا ہے اور زندگی اسی پرانے ڈھرے پر کانہا دیوی کے گھر میں بھی چلتی رہتی ہے اور گھر کے باہر بھی۔

اس تنگ تاریک بازار میں لکڑی کی منقش چیزیں بنتی اور بکتی ہیں، پیتل کی چیزیں ڈھالی جاتی ہیں اور سندھی دیہاتی کھڈی کے کپڑوں سے بازار پٹا پڑا ہے۔ ان گلیوں میں لوگ جب کھوے سے کھوا میلاکر چلتے ہیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ انمیں کون ہندو ہے، کون مسلمان۔ یوں بھی سب ایک دوسرے کو سلام کرنے کے عادی ہیں اور یہاں اپنے سے بڑوں کے پیر چھونے کی رسم سے یہ شناخت کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ پیر چھونے والا ہندو ہے یا اسکے سر پر

Scanned by CamScanner

ہاتھ رکھنے والا۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں ہندو ہوں، یا دونوں مسلمان۔ البتہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو ان دوکانوں میں نظر نہیں آتی ہیں۔ مثلاً پوجا کی مورتیاں، بھاگوت گیتا اور گھر میں لگانے کی آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی بڑی بڑی رنگین تصویریں جو کانہا دیوی کے بیٹھنے کے کمرے کی دیواروں پر بھاری سنہری لکڑی کے فریموں میں آویزاں ہیں اور اسکے پیچھے چھپے ہوئے چھوٹے سے پوجا کے کمرے کو بھی ویسی ہی چھوٹی تصویروں سے سجایا گیا ہے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں ایک طاق میں پیتل کی شیو کی مورتی رکھی ہوئی ہے اور ایک پیتل کا چراغ۔

ان دو کمروں میں جاکر ایسا لگتا ہے ہم کسی دوسری ہی دنیا میں آگئے ہیں، وہ دنیا جو کبھی پہلے بستی تھی—چھپ کر مکھن کھانے والے کرشن گوپال، سونڈ والے گنیش، شیو پاربتی، دوشاسن کا دروپدی کی ساڑھی اتارنا اور ایک آن دیکھے نیلے ہاتھ کا اسے اس طرح چھوٹ دیتے جانا جس طرح کوئی پتنگ لڑاتے میں مانجھے اور ڈور کی ڈھیل دیتا جائے، دیتا جائے، اتنی کہ کھینچ کر کاٹ دینے والا جھلا کر بیٹھ جائے۔ اور یہی دروپدی کے ساتھ ہوا تھا۔

"عورت جب تک خود اپنے کو کٹی پتنگ بنانے پر آمادہ نہ ہو جائے اسکی ساری کے پاٹ چاہے کتنے ہی کھلتے جائیں وہ انکی پرتوں کے اندر چھپی رہتی ہے حتیٰ کہ دوشاسن جیسے لوبھی ہاتھ تھکن سے مات کھا جاتے ہیں"۔

یہ سب بتاتے ہوئے کانہا دیوی خود مجسمۂ عصمت بنجاتی ہیں۔

اس تصویر میں رامچندر جی کی کھڑاؤں بھرت اتار رہے ہیں کہ لیجاکر انکی غیر حاضری میں تخت پر رکھ دیں اور خود بجائے گدی پر بیٹھنے کے اسکے آس پاس کہیں کھڑے ہوکر پروکسی سے راج کریں۔ آج کل تو ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ پروکسی دینے والا بھلا خود کب تخت سے دست بردار ہونے کو تیار ہوگا اور دوسرا گدی چھوڑکر کیوں جنگل کی راہ لینے لگا! اور وہ بھی اپنی کھڑاؤں تک اپنے بھائی کے حوالے کرکے!!

کانھا دیوی کی بہن سومر یعنی پیر کے دن شیو کا برت رکھتی ہیں اور انکا دیور جو سال کے کچھ مہینوں میں ٹھیک رہتا ہے اور کچھ مہینوں میں اس پر چیخنے چلانے کے دورے پڑتے ہیں صبح سویرے اٹھ کر پکھیوں کو دانہ ڈالتا ہے۔ اس سمے انکی چھت کی منڈیر پر چڑیاں اتر آتی ہیں اور پرسو مل سندھی میں بھاگوت پڑھتا ہے جو آٹھ دس سال پہلے اسے کسی نے بھارت سے لاکر دی تھی۔

اسکا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ آج کل ٹھیک ہے اور پورا گھرانہ سکھ کی سانس لے رہا ہے ورنہ جب اس پر تیزی کا دورہ پڑتا ہے تو وہ وانڑیوں یعنی خود اپنی ذات والوں کو گالیاں دینی شروع کردیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے بھاگوت پڑھتا وہ اپنی صحتمندی کے زمانے میں ہے اور اس پر اسکا عرفان تندی کے دور میں ہوتا ہے۔

وہ اپنے باپ اور بڑے بھائیوں کو وانڑیے کہہ کر پکارتا ہے جو سود پر روپیہ چلاتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں، شراب

Scanned by CamScanner

اڑاتے ہیں اور چرس کے دم لگاتے ہیں۔ یعنی ھر وہ کام کرتے ہیں جسے بھاگوت میں پستی سے منسوب کیا گیا ہے۔

اس وقت چانڈومل، مرچو مل، دھومی، سیتا، اشوک حتیٰ کہ خود کانہا دیوی تک خجل ھوکر رھجاتے ہیں۔ سب ناک کی نوک چھوکر کانوں کو ھاتھ لگاتے ھیں

”باپ رے باپ! ایشور نے اتنا گیان دیا ہے پر یہ نہیں کیا کہ اسکی بدھی کو تھوڑی لگام بھی لگا دیتا۔“

”اتنی عقل پرسومل کو دے کر اللہ نے ھم سب کی زلدگی مشکل میں ڈال دی ھے۔“

بھلا کوئی کہے گا یہ کانہا دیوی کے الفاظ ہیں؟۔ لیکن ھیں۔

یہ لوگ گفتگو میں جس طرح سلام کرنے کے عادی ہیں اسی طرح اللہ اور انشااللہ بھی ان کی زبان سے دن رات نکلتا رھتا ہے اور اس پر انہیں کوئی نہیں ٹوکتا۔ کسی کے اعتقاد کے مختلف ھونے سے اسکا بنانے والا تو مختلف نہیں ھو جاتا!۔

ایسے سمے میں اکثر انکے مسلمان پڑوسی پرسومل کو سمجھا بجھاکر اپنے گھر لیجاتے ہیں۔ کوئی اسے تعویز لاکر پہناتا ہے کوئی پاؤں کے انگوٹھوں اور کلائیوں پر سیاہ دھاگا باندھتا ہے اور کوئی عورت کسی مزار کا پڑھا ھوا پانی اسے ھزار منتوں سے پلاتی ھے اور پرسومل جو کھانے پینے کے معاملے میں قطعاً ویشنو ھے اسکے گلاس کا پانی بالآخر پی ھی لیتا ھے۔ یہ نہیں کہتا ”نہیں میں تمہارے گلاس میں نہیں پیونگا تم لوگ گوشت کھاتے ھو“۔ اس دیوانگی کے عالم

میں وہ وہ کچھ گذرتا ہے جو انسان میں واقعی برا ہے، وہ نہیں جسے انہوں نے ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کیلئے وضع کیا ہے۔

ان لوگوں کے بھارت سے آنے والے رشتے دار ان تیس بتیس سالوں میں وہیں کے وہیں ہیں جہاں انہیں صدیوں پہلے منو نے چھوڑا تھا۔ ذات پات کے بندھنوں میں گرفتار۔

ان میں سے اکثر کے بچے اب ہندی لکھتے اور پڑھتے ہیں اور جب وہ کانھا دیوی کے صحن میں آس پاس کے مسلمان بچوں کے سنگ کھیل میں لگ جاتے ہیں تو کانھا دیوی تو نہیں، بھارت سے آنے والی دھرم پر اٹل بوڑھی عورتیں اچنبھے سے اس سین کو دیکھتی ہیں جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا ہو۔ کانھا دیوی کے پاڑے کے بچے تو بچے بڑے بوڑھے تک۔ ایسا لگتا ہے اس چوتھائی صدی میں چھوت چھات، ذات پات اور اونچ نیچ کی دیواریں پھلانگ چکے ہیں اور ایک ایسے کھلے میدان میں آگئے ہیں جہاں براھمن سری رام کا لڑکا، دھومی مل وانڑیے کی لڑکی سے شادی کرنے والا ہے اور کوئی اس بات کا نوٹس تک نہیں لے رہا ہے۔

یہی نہیں یہاں کے شودر جاتی لوگ رام لیلا رچاتے ہیں۔ جسمیں اوکھا کا لڑکا پچھلے ۶،۷ سال سے راجہ رامچندر بنتا آرہا ہے اور کالج میں وہ اور برہمن اور مسلمان لڑکے اکثر' ایک ہی گلاس سے پانی پیتے ہیں۔ جس طرح کانھا دیوی کے صحن میں کھیلنے والے بچے۔ اور باوجود ہندو مذھب سے اپنی عقیدت کے کانھا دیوی کو یہ بات نہیں کھٹکتی ہے

کہ وہ مسلمان بچوں کیلئے علیحدہ گلاس رکھیں اور بھارت سے آنے والے راسخ العقیدہ ہندو مہمانوں کے کھانے پینے کے برتن جُدا۔

چنانچہ جب کانہا دیوی اپنے لڑکے کیلئے بھارت سے دلہن بیاہ کر لائیں تو انکے گھر میں عجیب طرح کا کھنچاؤ پیدا ہوگیا جس سے وہ خود کافی عرصہ تک ناواقف رہیں۔ انکی زندگی پاپڑ بیلتے ہوئے گذری تھی جو گھر بھر کو روزانہ چاہئیے ہوتے تھے۔ یہ پاپڑ محلے میں بھی بٹتے تھے اور آنے جانے والوں کی خاطر تواضع کے کام بھی آتے تھے۔ اسی طرح وہ سال بھر اچار ڈالتی رہتی تھیں۔ تیہواروں پر میٹھی ٹکیاں اور حلوے بناتی تھیں۔ دو طرح کا کھانا بنانا انکی ذمہداری تھی ایک وہ جسمیں انڈا، مچھلی، گوشت سب ہی شامل ہوتے تھے اور دوسرا وہ جسکے بنانے میں وہ چمچہ تک استعمال نہیں کیا جاتا تھا جس سے گوشت کا شوربہ چلایا گیا ہو۔ سب ہی کام ایسا لگتا تھا ہمیشہ سے انکے ذمے رہے ہیں — کیا باپ کے گھر، کیا پتی کے۔

پرسو کی بیوی انکی چھوٹی بہن تھی اور شوہر کے ساتھ ساتھ آدھی پاگل وہ خود بھی ہو چکی تھی۔ اسکو صرف ایک ہی کام آتا تھا شیو کی اگربتی جلانا، شیو کا برت رکھنا۔ لیکن بچہ اسکے نصیب میں نہیں تھا۔

اس ہو حق میں جہاں گھر کے دوسرے افراد ساون بھر جوا کھیلتے تھے اور اس آس میں جیتے تھے کہ کب ہولی دیوالی آئے اور نشہ کرنے کو ملے کانہا دیوی ہی جانتی تھیں کہ

کس جگرے سے انہوں نے گھر چلایا تھا۔

بہو کے آنے تک وہ اپنی تھکن کو مان چکی تھیں اور پہلے سے طے کئے بیٹھی تھیں کہ وہ آئے اور میں گھر کا چارج دے کر دن بھر جھولے میں بیٹھ کر اپنے پڑوس کی عورتوں سے کچھری کیا کروں، پان کھاؤں، سگریٹ پیئوں اور وقت پر پکا پکایا کھانا میرے سامنے بہو لے آیا کرے۔

لیکن دمینتی نے چارج لیتے وقت یہ نہیں کہا کہ 'ٹھیک ہے کام میں کرونگی لیکن بتانا آپکو پڑے گا کہ کتنے پاپڑ بنینگے، کس موقع پر کتنا خرچہ کرنا ہوگا اور کس دن کیا پکایا جائیگا۔'

کانہا دیوی کو بعد میں اندازہ ہوا دو، تین مہینے بیٹھی بیٹھی دمینتی اندر ہی اندر کھولتی رہی ہے۔ اسے آس پاس کے بچوں کا گھر کے صحن میں دوڑنا بھاگنا اکھرنے لگا تھا۔ حالانکہ اگر کوئی اسے سمجھاتا تو اصل بات یہ تھی کہ اسے بچوں سے نفرت نہیں تھی — انکا باورچی خانے میں بے روک ٹوک آنا جانا اسے اتنے دنوں کھٹکتا رہا تھا۔ دمینتی کو بھارت سے آنے والے مہمان برے نہیں لگتے تھے انکا وہ سواگت کرتی تھی خواہ انہیں ان لوگوں کی محبت یہاں کھینچ کر نہ لائی ہو— کیونکہ انہیں سے اکثر کو اپنے مرشد کے مزار پر وہ قرضہ چکانا ہوتا تھا جو منت مانگتے سمے وہ خود پر چڑھا بیٹھتے تھے۔ جیسے خود کانہا دیوی اجمیر میں حاضری دینے جا چکی تھیں۔

بھارت سے آنے والے مہمان وہاں کی سوغاتیں لاتے تھے— رنگ برنگی بندیاں، ساڑیاں— جنکی وہ خود عادی تھی اور

جنسے اسکے سسرال کی لڑکیاں عاری تھیں، فلمی رسالے اور وہاں کی کہانیاں۔

یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی تھی لیکن اس گھرانے کی پرانی ماننے والیاں اسے کھلنے لگی ہیں یہ بات کانہا دیوی کے علم میں نہیں تھی۔ مسلمان عورتیں اور مرد اور ذات پات کی اہمیت سے نابلد ہندو مہمان جن پیالیوں میں چائے پیتے تھے انہیں چائے پینے کو اسکا دل راضی نہ ہوتا تھا۔ یوں بھی کسی کے رامو، شیامو، یا گوپی ہونے سے اسکی ذات کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ اور یہاں؟ جسے دیکھو بن بلائے کا مہمان تھا۔

کانہا دیوی مسلمانوں کے گھر نہ صرف خود جاتی تھیں بلکہ اسے بھی ساتھ لیجانے پر مصر ہوتی تھیں۔

ایسا لگتا تھا ان لوگوں میں دھرم، یعنی اسے جس حد تک وہ جانتی تھی، دم توڑ چکا تھا، اور دیواروں پر لگی ہوئی سرسوتی، لکشمی اور کرشن اور گوپیوں کی تصویریں صرف گھر میں برکت اور حفاظت کیلئے لگی ہوئی تھیں۔ ورنہ غیر دھرم والوں سے نفرت کا نہ ہونا اسکے نزدیک اس بات کی علامت تھی کہ یہاں والے عقیدے کے اعتبار سے پھس پھسے تھے۔

ویسے بھی ان لوگوں سے اسکا علم کہیں زیادہ تھا۔ بھاگوت اسے ازبر تھی، ہندو ناموں کے معنی وہ جانتی تھی اور اتنے سالوں میں جس دیس کو وہ پیچھے چھوڑ کر آئی تھی وہاں پر ہونے والے متعدد فرقہ وارانہ فسادات اور ہریجنوں سے اونچی ذات والوں کے تصادم نے اسمیں مذہب کی وہ حس جگادی تھی جو نفرت پر پلتی ہے۔

یہاں والوں میں سے کتنے ایسے تھے جو بھارت گئے تھے اور پانڈرائیں کرکے لوٹے تھے!

ایک رات اس نے کشن چند سے کہا

"کیا ہم ہمیشہ یہیں رہینگے؟"

"ہمیشہ کیا مطلب؟" کشن نے چونک کر پوچھا۔ اسے نیند آ چلی تھی اور دمینتی کا یہ سوال اسکے دماغ پر بم کے دھماکے سے پھٹا۔

"تمہیں یہاں رہنا پسند ہے؟"

"تمہیں نہیں پسند؟" کشن نے پوچھا۔ دمینتی خاموش رہی۔ "کیوں میں پسند نہیں ہوں؟ کسے چھوڑ آئی ہو وہاں؟"۔ اسنے خطرے کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بات نہیں ہورہی ہے۔ میں تو یہاں کا کہہ رہی تھی"۔

"یہاں تو یہاں ہے ہی" کشن نے کہا "میں خود یہیں کا ہوں۔ مجھے یہ جگہہ پسند نہیں ہوگی تو کسے پسند ہوگی اور میں اس جگہہ کو پسند نہیں کرونگا تو پھر کسے پسند کرونگا"۔

دمینتی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ بہت سوچ سمجھ کر وہ ایک ایک بات کہہ رہی تھی، جس طرح شادی کے بعد ہر لڑکی پہلی بار شوہر سے کوئی دنیاداری کی بات جھجکتے ہوئے کرتی ہے اور جسکی تان بالعموم سسرال والوں کے بارے میں اسکی رائے پر ٹوٹتی ہے۔ بولی

"مجھے یہاں کا رہن سہن کچھ عجیب سا لگتا ہے"۔

"تمہارا کچھ مختلف تھا؟" کشن نے پوچھا۔

"ہاں" دمینتی نے کہا "وہاں ہم لوگ برابر والوں سے ملتے تھے۔ ہر ایرا غیرا رسوئی میں جوتے لئے نہیں گھسا آتا تھا اور— نہ ہی گھر میں گوشت پکتا تھا"۔

کشن نے کہا "میں تو جب جب گیا مجھے گوشت کھانے کو ملا"۔

"اوروں کے گھر ملا ہوگا۔ ہمارے یہاں نہیں؟"

"پھر۔ تمہارے گھر کے مرد گوشت کہاں کھاتے ہیں؟"

"ہوٹلوں میں" دمینتی نے ہنس کر کہا۔

"اچھا تو تمہارا مطلب ہے میں اور باقی گھر کے مرد یہاں بھی ہوٹلوں میں کھانے لگیں"۔

دمینتی نے بار بار بات کو آگے بڑھانا چاہا لیکن ایسا لگتا تھا کشن اور وہ ریڈیو کی ۲ مختلف ویولینتھس پر بات کر رہے تھے۔ بالآخر کشن چند نے کہا۔

"میرا خیال ہے اگر تم بھی یہاں پیدا ہوئی ہوتیں تو امّی کی طرح آجکو ہوتیں۔ اپنے دھرم پر قائم بھی اور دوسرے دھرم والوں سے متنفر بھی نہیں۔ میں بھلا یہ ملک کیوں چھوڑنے لگا۔ دِس از اے لینڈ آف آپرٹیونٹی"

This is a land of opportunity

"وہ کیا؟" دمینتی نے بھولپن سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ مجھے بھارت وارت نہیں جانا— میں یہیں خوش ہوں۔ انہی لوگوں میں پل کر بڑا ہوا ہوں اور انہی کو اپنا سمجھتا ہوں۔ یہ تمہاری بدقسمتی تھی کہ جس ماحول میں تھیں وہاں اکسانے والے بھرے پڑے تھے جن کا دھندا کبھی اس مذہب کے خلاف اس مذہب والوں کو بھڑکا کر چلتا ہے اور کبھی ایک ذات والوں کو دوسرے کے— سیاست دان

Scanned by CamScanner

خوش قسمت ہیں کہ اس دور میں بھی انہیں مذہب کے نام پر جنتاکو بھڑکانے والے مل جاتے ہیں"۔

اسکے بعد کئی بار دمینتی نے اکیلے میں گھر کے چھوٹوں اور اپنے شوہر کو بات بات پر انشااللہ کہنے پرٹوکا۔ اسنے اپنی پیالی الگ کرلی اور اگر کانھادیوی کے ساتھ اسے جبراً قہراً پاڑے کی کسی مسلمان عورت کے گھر جانا پڑتا تھا اور وہ'ں بازو کے ہوٹل سے چائے منگائی جاتی تھی تو وہ کسی نہ کسی بہانے اسے بے پئیے اٹھ جاتی تھی

کچھ ہی دن بعد کانھادیوی کا شوہر جو پھٹی (روئی) کا آڑھتی تھا اور بیاج پر روپیہ بھی چلاتا تھا ایک صبح وقت سے پہلے ہی گھر لوٹ آیا۔ پوچھنے پر پتہ چلا بھارت کے ایک صنعتی شہر میں دو مذہبی فرقوں میں تصادم ہو گیا تھا۔

ہمیشہ کی طرح کانھادیوی نے بغیر دلچسپی لئے پوچھا "پھر کیا ارادہ ہے؟ سامان باندھوں؟"

باورچی خانے میں دمینتی کے ھاتھ رک گئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کانھا دیوی کے لہجے میں طنز ہے

کیونکہ پچھلے تیس بتیس برس سے اس گھر میں اسی طرح ہوتا آیا تھا۔ چندرمل کاروبار تو کرتا تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پرندہ شاخ پر بیٹھا اڑنے کیلئے پر تول رہا ہے۔ وہ روپیہ پھنسانے کا قائل نہیں تھا۔ دوسرے وانڑیوں کو چنتا چھوکر نہیں گئی تھی۔ کسی کی بیکری تھی، کسی کا

Scanned by CamScanner

ہوٹل، کوئی فلم بنا رہا تھا اور کوئی کنٹریکٹر تھا۔ صرف چندر مل ہمیشہ سے ہوائی گھوڑے پر سوار تھا اور ہر بار جب بھارت میں فسادات ہوتے تھے اور اسکی خبر یہاں پہنچتی تھی تو وہ جھولے میں بیٹھ کر گھبراہٹ میں اپنی ٹھوڑی کے نیچے کے بال چن چن کر اکھاڑنے لگتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں پرسومل والی بیماری کی رمق اس میں بھی ہے۔

اس دن بھی یہی ہوا تھا۔ جب وہ بازار گیا تو لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

صرف فوٹو گرافر لیلا رام نے آہستہ سے پوچھا

"صبح بی-بی-سی- سنا تھا؟"

"نہیں- کیوں؟" چندرمل نے گھبرا کر پوچھا- "تمنے سنا تھا؟"

"بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے ہیں"-

"کہاں؟" چندر مل نے پوچھا حالانکہ جواب اسے خود معلوم تھا۔

"بھارت میں چاچا" لیلارام نے کہا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنا چاہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اسکے کان میں اخبار والوں کی آوازیں آنے لگیں 'ہندو مسلم فسادات میں ۳ سو مسلمان شہید کردیئے گئے'

'مسلمانوں کے ہجوم پر پولیس کی فائرنگ'

ان الفاظ کے پیچھے اشتعال پیدا کرنے والوں اور اشتعال پر جینے والوں کی آواز پوشیدہ تھی- اخبار بیچنے والے خوش

تھے کہ آج کام جلدی نمٹ جائیگا۔ صرف چندرہل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا کرے۔

اسنے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بازار کا چکر لگایا یہ جاننے کیلئے کہ یہاں کے لوگوں کا کیا موڈ تھا۔ لیکن لوگ اپنی فکروں میں لگے ہوئے تھے کسی کو پولیو زدہ بچے کو لیکر ہسپتال جانا تھا کسی کی عدالت میں پیشی تھی۔ البتہ ہندو دوکاندار اور دنوں سے زیادہ اپنے کام میں منہمک نظر آرہے تھے جیسے لوگوں کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

دیپک ٹیلر ماسٹر سر جھکائے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کپڑے پر نیلے چاک سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اسکا لڑکا ایک بلوچی نوجوان کا ناپ لے رہا تھا۔

وہ رات دمینتی کو بڑی طویل محسوس ہوئی کیونکہ کشن نے فسادات کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ پکچر دیکھ کر آیا تھا اور جلد ہی پڑکر سو گیا۔

اس دو منزلہ مکان میں جس میں دس پندرہ آدمی رہ رہے تھے وہ خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اسے کھٹکا سا تھا کہ اب کچھ ہونے والا ہے۔ چوکیدار کی ہر سیٹی پر وہ چونک پڑتی تھی۔

صبح کے وقت جب آس پاس سے اذانوں کی آوازیں ہوا میں گونجنے لگیں اور باہر ابھی اندھیرا ہی تھا تو اسے احساس ہوا حالات نے اسے زمین کے ایک ایسے گوشے میں لا پٹکا تھا جہاں سے فرار کی کوئی راہ نہیں نکلتی تھی

Scanned by CamScanner

اور اسکی حالت اس جانور کی سی تھی جسے کھونٹے سے باندھ کر مارا جا رہا ہو۔ اسے اپنی موجودہ حالت میں اور اس حالت میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا جب وہ اپنے دیس میں تھی۔ یہی خبر اگر اسنے آج وہاں بیٹھ کر سنی ہوتی تو شاید اسکے کان پر جوں تک نہ رینگتی، اور نہ ہی اسکی نیند اڑتی۔

بن ماں باپ کے بچے کی طرح ہر اقلیت کو خواب میں بھی ڈرنے کی عادت ہوتی ہے۔

جب کشن سوتے میں کنمنایا اور بولا "تم اٹھ گئیں؟ کیا صبح ہو گئی؟" تو دمینتی نے کہا "میں سوئی ہی کب تھی"۔

کشن نے لیٹے لیٹے اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی سوجے ہوئے پپوٹوں والی دمینتی کے گلے میں بانہیں ڈال کر پوچھا

"کیوں کیا ہوا؟ کسی نے تمہارے گلاس میں پانی پی لیا؟"

"وہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ کون کہاں تک بچ کر رہ سکتا ہے"۔

"تو بچنا چھوڑدو اور سب میں مل جاؤ" اسنے اسکے بالوں کی لٹ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

دمینتی نے اسکی بانہوں سے اپنی گردن نکال لی اور بولی

"تم بھارت چلو میرے ساتھ۔ یہاں مجھے کبھی سکون کی نیند سونا نصیب نہیں ہوگا"

”کیوں؟ یہاں کیا مسہری میں کانٹے اگتے ہیں؟“
”یہ تمہارا ملک نہیں ہے۔ ان لوگوں کا ہے“۔
”کن لوگوں کا؟“ کشن نے پوچھا
”ان لوگوں کا جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں — جنہوں نے اسے دھرم کے نام پر بنایا ہے“۔

کشن کچھ دیر تک اسکے چہرے پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھتا رہا۔ پھر بولا

”اگر ایک عورت کسی کی بیوی ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی ماں بن سکتی ہے تو زمین کا ایک ہی ٹکڑا جو ایک فرقے کیلئے اسلئے قابل عزت ہو کہ اسے مذہب کے نام پر حاصل کیا گیا ہے دوسرے کیلئے ماتر بھومی ہونے کے لحاظ سے کیوں پوجا کے لائق نہیں ہو سکتا؟

جب تم کسی کی ماں بنجاؤگی تو کیا میری بیوی نہیں رہوگی؟

یا یہ کہ دو دمینتیاں ہوں تب ہی یہ سوچا جاسکتا ہے کہ ایک ماں ہے اور دوسری بیوی!“

وہ ہنس پڑی۔ لیکن دل اندر سے دھکر پکر کرتا رہا۔ اذانوں کی آواز اتنے قریب سے اس نے پہلے نہیں سنی تھی۔

صبح ہی صبح جب وہ چھت پر کسی کام سے گئی تو اسنے دیکھا پرسو معمول کے مطابق چڑیوں کو دانہ ڈال رہا ہے — یہ کام ایسا تھا جو وہ بیماری میں بھی نہیں بھولتا تھا۔

اس گھر کا آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ کیا ساس، کیا شوھر اور کیا شوھر کا چاچا پرسومل۔ ورنہ ایسے سمے میں کون اچنت ھوسکتا تھا! اور چڑیوں کو دانہ کھلانے کی سوچتا۔

وہ بجائے کام ختم کرکے واپس لوٹ جانے کے وہیں کھڑی ھوکر پرسو مل کو دیکھتی رھی جو ھاتھ جوڑ کر سورج کو پرنام کر رھا تھا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رھا تھا۔

"کچھ مجھ سے پوچھنا ھے؟" پرسومل نے کچھ دیر بعد شفقت سے اس سے پوچھا۔

"ھاں" دمینتی نے کہا۔ "کل ھندو مسلمان فساد ھوا ھے"۔

"کہاں؟" پرسو نے بے دلی سے پوچھا۔

"انڈیا میں"۔

"وہ تو ھوتا ہی رھتا ھے" پرسو نے ایسے کہا جیسے کہہ رھا ھو 'زکام تو ھوتا ہی رھتا ھے'۔

"آپ انڈیا جانے کا نہیں سوچتے؟" دمینتی نے کہا۔

"نہیں۔ یہ بات تمہارا سورا سوچتا ھے۔ میرا بڑا بھائی۔ میں نہیں"۔

"آپ کو ڈر نہیں لگتا کہ یہاں کے لوگ اگر بھڑک گئے تو چاروں طرف وہ ہی وہ ہیں۔ مجھے تو رات بھر نیند نہیں آئی"۔

پرسو نے ھاتھ سے آسمان میں ایک طرف کو اشارہ کرتے ھوئے کہا

Scanned by CamScanner

"دیکھو وہ کیا ہے"

دمینتی نے ادھر دیکھ کر کہا "مسجد کا مینارہ"

"پرسو نے اپنی چھت پر دانہ چگتے ہوئے کبوتروں کی طرف سر کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

"یہ کبوتر رات کو وہیں سوتے ہیں۔ اور اب میں کچھ نہیں کہونگا۔ اس سے زیادہ بولنے کی مجھے اجازت نہیں ہے"۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی کس کی طرف سے اجازت نہیں ہے لیکن پرسو کو دوبارہ پوجا میں مگن دیکھ کر اسے خاموش رہنا پڑا۔

نیچے جاکر دمینتی نے جب کانتہا دیوی کو یہ بات بتائی تو بجائے ہنسنے کے انہوں نے بڑی عقیدت سے کہا

"پرسو کو لاکھ لوگ پاگل کہتے ہوں پر اس کا ایسا گیانی۔ اس پاڑے میں تو کیا۔ پورے شہر میں اہیں ملے گا"۔

——.——

اندھیرے کی کرنیں

لمبے پتلے آدمی نے مکرانی ڈرائیور سے کہا "میں اشارہ کروں تو تم سلو کرنا۔ ایکدم سلو۔ سمجھے؟"

ڈرائیور نے 'ہاں' والے انداز میں سر ہلایا۔

پھر ہارن دینا۔ پپ، پپ پپ، پپ، پپ ـ پپ، پپ پپ، پپ ـــ بس دو دفعہ۔ سمجھے؟"

ڈرائیور نے دوبارہ 'ہاں' والے انداز میں سر ہلایا۔

"پھر ڈیڈ اسٹاپ کرکے ـــ"

"انجن کو ریس دینا ہے" مکرانی ڈرائیور نے کہا

پر انجن بند مت کرنا۔ سمجھے؟"

"سمجھا صاحب، سمجھا" ڈرائیور نے جھلاکر کہا

ٹین کی چھتوں والا محلہ چاندنی میں سویا ہوا سا لگ رہا تھا۔

کار کی رفتار آہستہ ہوئی، دو دفعہ پپ، پپ پپ، پپ، پپ کی تال پر ہارن بجا، کار کے اگلے حصّے سے وہی آواز نکلی جو موٹر گیراجوں میں دن بھر سنائی دیتی ہے۔ اسکے بعد بتی ڈم کرکے مکرانی نے سگریٹ سلگانے کیلئے ڈیش بورڈ سے سگریٹ لائیٹر نکالا جسے گرم کرنے کیلئے

اس نے ٹین کی چھتوں والے محلے کو دیکھتے ہی دبا کر 'آن' on کردیا تھا۔

لمبے پتلے آدمی نے مکرانی ڈرائیور کے چڑھ جانے والے لہجے کو بغیر محسوس کئے ہوئے آہستہ سے کار کا دروازہ کھولا اور پہلے سر ادھر ادھر گھما کر دیکھا جیسے وہ کار سے نہیں جنگل میں اپنی بیل سے باہر نکل رہا تھا۔

مکرانی سگریٹ پیتا رہا، پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی بھی خاموشی سے سگریٹ پی رہا تھا۔ دونوں کچھ کچھ اکتائے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ یہ ڈرامہ اندھیرا ہونے کے بعد سے اسی طرح پچھلے ایک گھنٹے سے کھیلا جا رہا تھا۔ جیسے کسی بڑے ڈرامے کا ریہرسل ہو رہا ہو اور ڈرائیور کو ہر بار ہدایت دینے والا آدمی اسکا ڈائریکٹر تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کا رول بہت کم تھا، وہ ضرورت پڑنے پر بولتا تھا اور پھر خاموشی سے سگریٹ پینے لگتا تھا۔ یوں بھی کہا جا سکتا تھا آسکا مین رول شروع ہونے میں ابھی "دیری" تھی۔

سیٹ البتہ بدلتے جا رہے تھے۔ پیلے رنگ کے کوارٹرز، مٹی تھوپ کر اٹھائی ہوئی دیواریں جن پر ٹین کی نالیوں والی چھتیں تھیں، لکڑی کے کیبن نما مکان، اور چار منزلوں والے فلیٹ۔

موجودہ سیٹ زنگھیائی ہوئی چھتوں کے مکانوں کا تھا، جنمیں سے بعض کے دروازوں پر ٹاٹ کے پردے ہوا میں پھٹپھٹا رہے تھے، کسی کسی کی دیواروں کے جوڑوں میں سے روشنی چھن کر باہر آرھی تھی، اِکّا دُکّا میں سے ٹرانزسٹر ریڈیوز بجنے کی آواز بھی آرھی تھی لیکن زیادہ تر ایسے تھے جنکے مکین غالباً سو چکے تھے۔

Scanned by CamScanner

اس سیٹ پر گلیاں، سڑکیں اور بجلی کے کھمبے نابود تھے۔ صرف پانی کا کمیونٹی ٹیپ چاند کی روشنی میں کھڑا سویا ہوا سنتری سا لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد خاموشی سے لیکن تیزی سے چلتے ہوئے تین آدمی کار کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے جنکے نزدیک پہنچنے پر پتہ چلا انمیں سے ایک تو وہی لمبا پتلا ہدایت کار تھا، دوسرا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جسکے ہاتھ میں دھیمی کی ہوئی لالٹین تھی اور تیسرا چہرہ ایک سانولی رنگت والی لڑکی کا تھا۔

پچھلی سیٹ والے آدمی نے جلتی ہوئی سگریٹ باہر گرادی جو کافی بڑی تھی۔ لڑکی کو پچھلی کھڑکی کے قریب ڈھکیل کر ادھیڑ عمر والے آدمی نے اسکے چہرے کے نزدیک لاکر لالٹین کی لو اونچی کردی۔

اسکی رنگت سانولی تھی اور چہرہ تندرست۔ لالٹین کی لو نیچی کردی گئی۔ پچھلی نشست والے آدمی نے اسے اندر آ جانے کیلئے کہا اور جب وہ اسکے پاس بیٹھ گئی تو مکرانی ڈرائیور نے اندر کی لائیٹ بغیر کہے ہی لمحہ دو لمحہ کو 'آن' کی اور آن دو لمحوں ہی میں اس آدمی نے لڑکی کا چہرہ اپنی طرف موڑ کر دیکھا اور ایجاب کے انداز میں سر ہلادیا۔

بتی بجھ چکی تھی اور لمبا پتلا آدمی، ادھیڑ عمر والے سے اس سودے کی جزویات پر جلدی جلدی بات چیت کر رہا تھا۔

پھر وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا، لالٹین والے آدمی نے ریت پر سے جلتی ہوئی سگریٹ اٹھالی اور اسے پیتا ہوا آن بے نیو مکانوں کی طرف چل دیا۔

Scanned by CamScanner

مکرانی ڈرائیور دھیمے سروں میں گا رہا تھا اور ہدایت کار اس کے برابر میں خاموش بیٹھا تھا۔ دونوں کو پچھلی سیٹ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

شہر کا سواد آنے پر لمبے پتلے آدمی نے مکرانی ڈرائیور کو ضروری ہدایات دیں اور جب وہ اتر گیا تو مکرانی ڈرائیور نے پہلی بار پچھلی نشست والوں کو بغیر دیکھے ہوئے ان سے سوال کیا۔

"کہاں چلنا ہے؟"

"سوسائیٹی" خاموش آدمی نے کہا

"کس جگہ؟" ڈرائیور نے کہا۔

"تم چلتے رہو جہاں مڑنا ہوگا میں بتا دونگا"

کار کی رفتار تیز ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد روزنامہ ہانف کا اڈیٹر نمبر ۲ جب اس لڑکی کے ساتھ، جس نے اپنا نام ثریا بتایا تھا ٹیکسی سے اتر رہا تھا تو نیگرو ڈرائیور نے ایک بار پھر کہا

"تین بار ھارن کی آواز ہوگی پپ۔پپ پپ۔پپ۔ بس ایک دفعہ"۔

"ایڈیٹر نے تھوڑی جھلاہٹ سے کہا "معلوم ہے"

لڑکی نے بھی اپنا سر 'ھاں۔معلوم ہے' والے انداز میں ھلا دیا۔

نیگرو ڈرائیور جسے مقامی زبان میں شیدی کہنا کافی تھا، کیونکہ اس سے زیادہ اس کا نام جاننے کا کوئی خواہش مند نہیں تھا جس بے نیازی سے ٹیکسی چلا کر یہاں تک لایا تھا اسی بے نیازانہ انداز سے اسے وہاں سے لیکر روانہ ہو گیا۔ جاتے وقت اپنی موٹی، مردانہ آواز میں

وہ گا رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں اسکی آنکھوں کو چندھیا رہا تھا۔

ایڈیٹر تھکا ہوا تھا اور لڑکی لجا رہی تھی۔ اپنے پیچھے بڑا گیٹ بند کرکے وہ اندر کے دروازے تک پہنچے جو اندھیرے میں تھا اور جہاں گھنٹی بجانے کا پریس بٹن بھی لگا ہوا تھا۔

ایڈیٹر نے بٹن دبایا اور اس تھوڑی سی مدت کو گذارنے کیلئے اس نے لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا اور پھر اسکے بالوں میں اپنی انگلیاں گھسا کر اسکے سر کو اوپر اٹھایا۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا

"ہوں۔ تو تمہارا نام ثریا ہے!"

لڑکی نے بے دلی سے کہا "جی"

"نسیم اختر، شمیم اختر، نسرین، پروین کیوں نہیں ہے"۔

لڑکی نے کسمساتے ہوئے کہا "میری کمر میں آپکا ڈبہ چبھ رہا ہے"

اندر سے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ ایڈیٹر نے لڑکی کو چھوڑ دیا۔ اور وہ اپنے بال درست کرنے لگی۔

اس نے دیکھا لان پانی میں ڈوب رہا تھا لیکن اسکے باوجود زمین پر پڑے ہوئے پائیپ سے پانی کی پھواریں اٹھ رہی تھیں اور خود پائیپ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا لان سے دور، سیمینٹ کی بنگلے کے اندر کی سڑک پر سے ہوتا ہوا اندر اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

دروازہ کھولنے جو آدمی آیا تھا اسکے سر پر

سفید ٹوپی تھی اور شکل سے وہ کم عقل لگتا تھا۔ اسکے پاس سے گذرتے ہوئے ایڈیٹر نے کہا

"ستار تم جانتے ہو جس چیز میں دھان کوٹے جاتے ہیں اسے کیا کہتے ہیں؟"

"جی صاحب" ستار نے کہا

اندر پہنچ کر لڑکی کو اپنے پاس صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایڈیٹر نے کہا

"کیا کہتے ہیں؟"

"کنڑس" ستار نے کہا

"تم وہی ہو" ایڈیٹر نے کہا اور قہقہہ مارتے ہوئے اس نے لڑکی کی پیٹھ پر ایک دھپ لگائی۔

"ستار ھاتو ہے، کشمیری"۔ لڑکی اپنی جگہہ پر ہل گئی۔

تینوں ھنسنے لگے۔ کشمیری خفت سے، ایڈیٹر اس بے لگام طور سے جس سے محض شراب پینے کے بعد آدمی ھنس سکتا ہے اور لڑکی قدرتی انداز سے۔

ایڈیٹر نے اسے اپنی طرف کندھے سے کندھا ملاتے ہوئے کھینچا اور اسکی کنپٹی پر اپنی کنپٹی رگڑنے لگا۔

ایک بار پھر ایڈیٹر چلایا "کنڑس! پلیٹیں اور گلاس"

اور جب ستار وھاں پلیٹیں اور گلاس رکھ کر جانے جانے لگا تو اس نے کہا "اپنا حصہ لے لو"۔

کشمیری نوکر نے بڑی احتیاط سے گتے کا ڈبہ کھولا اور اسمیں سے بھنی ہوئی مرغی نکال کر ایک پلیٹ میں رکھی۔ جب وہ اپنا حصہ توڑنے کیلئے ھڈی چٹخا رھا تھا تو ایڈیٹر نے محبت والے لہجے میں کہا

"ستار۔ مس صاحب کو صبح ۶ بجے جانا ھے۔ تین بار ھارن کی آواز آئیگی پپ، پپ پپ، پپ — پپ، پپ پپ، پپ — ٹھیک ھے؟"

"ٹھیک ہے" ستّار نے کہا
"ہو سکے تو ایک پیالی چائے بھی پلا دینا"
ستّار نے اپنا سر 'ہاں' میں ہلایا۔ ایڈیٹر گلاس میں وھسکی انڈیل رہا تھا۔ پھر وہ چلایا
"کنڑس! "پانی!"
ستّار پانی کا جگ رکھ کر ڈرائینگ روم کی کھڑکیوں کے پردے بند کرنے لگا۔ ایسا لگتا تھا اسے معلوم ہے کیا کرنا ہے"۔

اسکے جانے کے بعد ایڈیٹر نے ڈرائینگ روم کا وہ دروازہ بند کردیا جو بقیہ گھر سے اسے ملاتا تھا۔ اب صرف ایک بیڈ روم کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا جو ڈرائینگ روم میں کھلتا تھا۔

لڑکی اٹھ کر، چل پھر کر چیزوں کو دیکھنے لگی۔ مچھلیوں کا ایکویریم جو مہاگنی کے پیڈسٹل پر رکھا ہوا تھا اور جسمیں مچھلیاں اس وقت ادھر۔ پانی میں بے جنبش تھیں۔ جیسے سو رہی ہوں۔ ایک چھوٹی سی میز پر ایک عورت کا مجسمہ تھا جسکی چھاتیاں ننگی تھیں اور جھلملاتے لباس کے نیچے ٹونڈی کا شائبہ تخلیق کیا گیا تھا، اسی طرح چہرے، کاندھوں اور ننگی پنڈلیوں پر پانی کی بوندوں کا شائبہ پینٹ کیا گیا تھا۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کب کے خاموش ہو چکے تھے کیونکہ اس وقت آدھی رات ہو رہی تھی اور باہر سے ٹریفک کی آواز گاہے گاہے لیکن مینڈکوں کی ٹر ٹر بار بار سنائی دے رہی تھی

اسنے دو پردوں کے بیچ میں سے سر باہر نکال کر ایک بار پھر باہر کی دنیاکو دیکھا — بھیگا ہوا لان، بل کھایا ہوا پائپ، لان کے سرے پر اگے ہوئے ناریل کے درخت جن میں

ناریل لدے ہوئے تھے اور انکے اوپر آسمان میں سفید بادل کی سی ایک لمبی لکیر جو ایک طرف کے افق سے دوسرے طرف کے افق تک چلی گئی تھی۔ اسے یاد آیا جب وہ ٹیکسی سے اتر رہے تھے تو سر پر سے ایک جیٹ گذرا تھا اور اس طرح کی لکیروں کو اس کا چھوٹا بھائی اور چھوٹی بہنیں اکثر گنا کرتے تھے کیونکہ ان کا گھر ایئرپورٹ کے نزدیک تھا۔

اسکے کانوں میں زور سے آواز آئی "ثریا!"
وہ چونک کر پلٹی
ایڈیٹر ہنس پڑا "تمہارا نام ثریا نہیں ہے"
لڑکی نے پوچھا "آپ یہ بار بار کیوں پوچھتے ہیں جی؟"

"اسلئے کہ مجھے معلوم ہے تمہارا اصلی نام کچھ اور ہے۔ چالیس پچاس سال پہلے ہر لڑکی کا نام زہرہ، مشتری اور نرگس ہوتا تھا۔ اب نسیم اختر، شمیم اختر، ثریا ہونے لگا ہے"۔

پھر اس نے گہری سوچ والے لہجے میں کہا "تمہیں معلوم ہے مینے تمہیں کتنی بار آواز دی ہے؟ تین چار بار— ایسے: ثریا — ثریا — اگر تمہارا نام ثریا ہوتا تو تم فوراً پلٹ پڑتیں لیکن تم نے جب دیکھا جب مینے زور سے کہا ثریا!"

وہ ہنسنے لگا۔ اپنی عمر کے لحاظ سے وہ تندرست بھی تھا اور جوان بھی کیونکہ اسکا جسم چھریرا تھا اور وہ اپنی حقیقی عمر اڑتالیس یا پچاس کا ہرگز نظر نہیں آتا تھا۔

وہ تیزی سے پینے کا عادی تھا اور اپنی لمبی چوکور بوتل کا دوسرا چوتھائی وہ اس گھر میں آنے کے بعد سے ابتک پی چکا تھا۔ ایک چوتھائی وہ پہلے ہی باہر کہیں خالی کر آیا تھا۔ آسنے تھوڑی سی سنہری شراب قلقل کی صدا سے

ایک صاف گلاس میں انڈیلی اور اس میں پانی ملاکر ثریا سے — یا وہ جو بھی تھی — پیار سے کہا "تھوڑی سی"۔
لڑکی نے 'نہ' کر دی
"بس ایک بوند"!
لڑکی چپ بیٹھی رہی۔
ایڈیٹر نے جھوم کر کہا "مے ہے"
لڑکی نے ہاں میں سر ہلایا۔ اتنی اردو وہ بھی جانتی تھی۔
"مگس کی قے نہیں ہے"
"کیا!!" لڑکی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پوچھا۔
"کچھ نہیں" ایڈیٹر نے ٹھنڈا پڑتے ہوئے کہا۔ اسکا سر نیند سے بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ خود کو جگانے کیلئے اس نے تھوڑی سی وھسکی اپنی کنپٹیوں پر ملی اور پھر دلار سے لڑکی سے بولا "ایک قطرہ"
لڑکی نے گلاس لیکر اسے سونگھا اور جھرجھری لیکر گلاس واپس رکھ دیا۔
"اچھا تو اندر چلئیے سرکار" ایڈیٹر نے بوتل وہیں میز پر چھوڑ دی اور اپنا گلاس لیکر بیڈ روم میں چلا گیا۔ اسکے پیچھے پیچھے لڑکی بھی اندر آ گئی۔
یہ کمرہ بھی کافی بڑا تھا اور اس میں ایک ڈبل بیڈ کے علاوہ ایک آرام کرسی، کپڑوں کی دو الماریاں جن میں لمبے لمبے شیشے لگے تھے، ایک ڈریسنگ ٹیبل اور اسکے پاس ایک کشن والا اسٹول بھی رکھا ہوا تھا۔
ایڈیٹر ڈبل بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر جوتے کے فیتے کھولنے لگا جوتے اور موزے اتارتے میں اس کا سر نیچے جھکا ہوا تھا اور بھرے ہوئے پیٹ پر دباؤ پڑ رہا تھا۔ جب سانس لینے کو اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو لڑکی اسے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کے دونوں ہاتھ،

Scanned by CamScanner

پشت پر قمیص کے اندر کسی جدوجہد میں مشغول تھے۔ شاید وہ وہاں لگا ہوا ہک کھول رہی تھی پھر اسنے قمیص کے اندر ہی اندر سے اپنی بریزئیر Brassiere اتار کر اسے آئینے پر ٹانگ دیا۔ خود وہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی مکان کی مالکن کی تصویر کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی جو رنگین تھی اور جس میں کم عمر مالکن ہر ممکن زیور اور چہرے کے ہر ممکن رنگ سے مزین اور تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اسکی نتھنی کا سنہری دھاگا گال کی سرخی کے اوپر سے ہوتا ہوا کان کے اوپر کے بالوں کے گچھے میں جاکر گم ہو گیا تھا۔

ہاتف کا ایڈیٹر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی سانولی رنگت کی تھی، تندرست اور معصوم اور اس سے یا اس کے شراب پینے سے خائیف نظر نہیں آتی تھی۔

نظریں ملنے پر وہ ایکدم چونک اٹھی اور خفت مٹانے کیلئے پوچھنے لگی "یہ آپکی بیوی ہیں؟"

"نہیں" ایڈیٹر نے کہا "لیکن یہ تمنے کیوں کیا—ثریا!"

"کیا؟" لڑکی نے تعجب سے پوچھا۔

ایڈیٹر نے نقل میں اپنی بش شرٹ کے اندر ہاتھ پشت پر چلائے، پھر انہیں بغلوں کے نیچے سے گذار کر جیسے کوئی چیز کھینچ کر دامن کے اندر سے نکالی اور آئینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ"۔

لڑکی جھینپ گئی۔

"یعنی بغیر کہے ہی!" — "اس طرح تو تم بہت دن جیتی نظر نہیں آتیں"

لڑکی خاموش رہی۔

ایڈیٹر بولا "وقت سے پہلے 'بڑھیا' ہو جاؤ گی۔ تمہاری

اور بہنیں تو اصرار کے باوجود بھی ---اور ابھی تو خود میرا ارادہ سونے کا نہیں ہے"

لڑکی نے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا "میں اس اصرار ہی سے ڈرتی ہوں۔ لوگ نشے میں ہوتے ہیں تو کچھ خیال نہیں کرتے۔ گھر میں پہننے کی تو اور بھی ہیں لیکن یہ میرے پاس بس ایک ہی ہے۔ پرسوں نسیم سے منگوائی

"نسیم اختر سے؟" ایڈیٹر نے پوچھا۔

"ھونھہ" لڑکی نے مختصر سی خفگی سے کہا "نسیم اختر ہی سے سہی لیکن چوبیس روپئے کی ہے--- اس سے پہلے جو تھی وہ تیس کی تھی اور ایک آپ سے بھی زیادہ پئیے ہوئے آدمی نے اسے اس بری طرح پھاڑا تھا کہ ھُک تو ھُک ٹکیں اور بخئیے تک ادھڑ گئے تھے اور پیالیاں بھی پھٹ گئی تھیں۔ صبح اسکی حالت دیکھ کر مجھے رونا آرہا تھا"۔

ایڈیٹر خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ لڑکی کو شبہ ہوا وہ غمگین ہو گیا ہے۔ لیکن جب وہ واپس آیا تو اسکے ایک ہاتھ میں بچی ہوئی مرغی کی پلیٹ تھی اور دوسرے سے وہ لمبی چوکور بوتل کو سینے سے لگائے ہوئے تھا، اور خود ہاتھ میں پانی کا جگ جھول رہا تھا۔

ایڈیٹر نے لڑکی کی طرف مرغی بڑھاتے ہوئے کہا "کیا عمر ہوگی تمہاری؟ تم ہو بڑی سیانی!"

"وہ کیسے" لڑکی نے پوچھا۔

"نام تم اپنا بتاتی ہو ثریا اور جھوٹی شرم کی بجائے کپڑوں کی اھمیت تمنے اتنی ہی سی عمر میں سیکھ لی ہے"۔

"آپکا کیا نام ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"لطف اللّٰہ لطیف"

"کیا؟" لڑکی نے عدم تیقن سے پوچھا۔

"چھوڑو۔ ہوگا کچھ۔ غلام محمد، غلام حسن، غلام علی"۔

کچھ دیر کیلئے خاموشی ہو گئی۔ ایڈیٹر ایک کریم کلرڈ پیڈ پر لکھی ہوئی عبارت میں کچھ ردوبدل کرنے لگا۔ اب سڑک پر مکمل خاموشی تھی اور ٹھنڈی اور نم ہوا کے جھونکے کھڑکی کے پردے کو ہلا ہلا کر وقفے وقفے سے کمرے میں آجاتے تھے۔

"یہ تصویر آپکی بیوی کی نہیں ہے تو پھر کس کی ہے؟"

"میرے دوست کی بیوی کی" ایڈیٹر نے بغیر سراوپر اٹھائے کہا۔

"اور دوست کہاں ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"بیوی کو لینے لاہور گیا ہوا ہے"

ایڈیٹر جلدی جلدی کچھ پوائنٹس نوٹ کرنے لگا جیسے وہ صبح کے مضمون کیلئے یادداشتیں جمع کر رہا ہو۔ لڑکی ڈریسنگ ٹیبل کی چیزوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ زیادہ تر وہی چیزیں تھیں جنہیں وہ خود استعمال کرتی تھی — ناخون کی چیزیں، گالوں کی چیزیں، بھوؤں کی پینسل، خوشبوئیں اور اودے، نیلے، ہرے رنگ — صرف انکے میک فرق تھے اور زیادہ سے زیادہ انہیں قیمتی کہا جا سکتا تھا جیسے یہ چیزیں اسکی اپنی چیزوں کی امیر رشتے دار تھیں۔

میز پر بہت سی جگہ خالی پڑی تھی اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا باقی چیزیں مالکن اپنے ساتھ لاہور لے گئی تھی۔

Scanned by CamScanner

"آپ کیا لکھ رہے ہیں؟" لڑکی نے پلنگ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

اسکی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور وہ چاہ رہی تھی اگر دو، تین گھنٹے کیلئے بھی آنکھ لگ جائے تو کل کا دن اتنا بُرا نہیں گذرے گا۔ ورنہ دن بھر سر درد، جھلاہٹ اور جلتی ہوئی آنکھیں تنگ کرینگی۔

"کل کے اخبار کیلئے کالم لکھ رہا ہوں"

"یہ کیا ہے؟"

دونوں نے بیک وقت کہا۔

"کالم کیا؟"

کونسی چیز کیا ہے؟" ایڈیٹر نے سر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

کپڑوں کی الماری کے اوپر سے لڑکی نے ایڑیاں اٹھاکر اُچک کر ایک خوبصورت سا گول ڈبہ نیچے اتار لیا۔ اسکا ڈھکنا سفید پلاسٹک کا تھا اور نارنجی رنگ کے جستے کے ڈبے پر ھلکے سُرخ پتے اور پھول بنے ہوئے تھے۔

لڑکی نے ڈھکنا اتار لیا جو اتنا بڑا تھا کہ اس میں ایک بچے کو باآسانی پیٹ بھر کر پانی پلایا جا سکتا تھا۔ ڈبے کے اندر سے ایک میٹھی سی مہک نکلی اور وہی مہک ڈبے پر لگے ہوئے سیاہ پریس بٹن میں سے بھی آرہی تھی۔

"یہ ـــــــ" ایڈیٹر نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہنا چاہا

"اسپرے ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

ایڈیٹر کے چہرے پر شرارت کی لہر دوڑ گئی اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں استعمال کرسکتی ہوں؟" لڑکی نے ایروسول کو سونگھتے ہوئے کہا

"ابھی نہیں" ایڈیٹر نے قلم بند کرتے ہوئے کہا

"پھر کب؟" لڑکی نے اس بچے کے لہجے میں کہا جسکی خواہش کو التوا میں ڈالا جا رہا ہو۔

"کل صبح" ایڈیٹر نے کہا "جب میں سو رہا ہونگا۔ مجھے جگانا مت۔ چپکے چپکے اٹھنا، اور چپکے سے پُش کرکے خاموشی سے اپنے گھر چلی جانا۔ گھر والے کہینگے 'بیٹی تو بڑی مہک رہی ہے آج' ---"

"ایسا لگتا تھا وقت کے سحر نے دونوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

"ابھی نہیں سونگھ سکتی؟" لڑکی نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔

"ابھی نہیں۔پہلے مجھے تمہیں سونگھنے دو"۔

لڑکی نے آہستہ سے بٹن دبایا۔ خوشبو پورے کمرے میں پھیل گئی۔

"نو۔نو۔نو۔ ہو ریچ" ایڈیٹر نے اسے روکتے ہوئے کہا (نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ کتیا کہیں کی)

لڑکی ڈرسی گئی۔

"آپ نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں" ایڈیٹر نے شرارت سے کہا "یہی کہ تم بہت پیاری لگ رہی ہو"۔

لڑکی ہنس پڑی

اس سے پہلے اس نے ٹی۔وی پر اس قسم کی بریس بٹن چیزیں دیکھ رکھی تھیں — شیمپو، ڈی اوڈرینٹس، ہیئراسپرے، پرفیومز وغیرہ۔ چھن بھر بعد وہ انہی میں سے ایک کی دھن گنگنانے لگی۔

Scanned by CamScanner

ایڈیٹر میں جیسے جان پڑگئی۔ اسنے کاغذ اور قلم اسٹول پر پھینکے اور پلنگ پر سے اتر کر اس نے پیچھے سے آکر لڑکی کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور اسکے بالوں کی ایک لٹ اپنے چہرے اور گردن پر ہولے ہولے پھیرنے لگا۔ سر میں سے بھی ہلکی سی خوشبو آرہی تھی جو ہو سکتا ہے کسی تیل کی تھی یا خود لڑکی کے فی الحال تندرست جوان جسم کی۔

وہ لڑکی پر جھول گیا تھا اور وہ نیچے دبی جارہی تھی۔

لڑکی نے گنگناتے ہوئے کہا "بالوں کیلئے؟"

ایڈیٹر نے اسکی گردن پر پیچھے سے پیار کرتے ہوئے کہا "نو"

"بغلوں کیلئے؟"

"نوپ" ایڈیٹر نے کھلنڈرے پن سے کہا "لیکن تم گاتی رہو"

"جسم کیلئے؟"

"یس" ایڈیٹر نے ڈبہ اسکے ہاتھ سے لیکر اسے الماری پر رکھتے ہوئے کہا اور لڑکی کو گود میں اٹھالیا۔

لڑکی نے ٹیلی ویژن کا جملہ اسی لہجے میں دہرایا

"خوبصورت لڑکیوں کیلئے مردوں کی پسند"

ایڈیٹر نے اسے بیڈ پر تھوڑی اونچائی سے چھوڑ دیا۔ لڑکی گرنے کے بعد دو چار بار اسپرنگس پر اچھلی اور ہنسنے لگی۔

لڑکی کو پلنگ پر چھوڑ کر ایڈیٹر اپنا گلاس ختم کرنے کیلئے ڈریسنگ ٹیبل تک گیا اور جب وہ لوٹا تو اسکے ہاتھ میں ایک کرنسی نوٹ تھا جو اسنے لڑکی کی

طرف بڑھا دیا۔ وہ جانتی تھی یہ انعام بھی ہے اور رشوت بھی۔

"تھینک یو" کرکے اس نے نوٹ لے لیا۔

جب ایڈیٹر اسکے برابر میں لیٹنے کی تیاری کر رہا تھا تو اسنے پوچھا "آپ کیا لکھتے ہیں؟"۔

"اخبار" ایڈیٹر نے فخر بھرے لہجے میں کہا۔

"کونسا؟"

"ہے۔ایک شام کا اخبار"

"اور اتنی پی کر بھی آپ لکھ لیتے ہیں"

ایڈیٹر نے گمبھیر لہجے میں کہا "جس طرح گیہوں کی روٹی کیلئے لوہے کا پیٹ چاھئیے ہر ایک کو ہضم نہیں ہوتی، اسی طرح پینے کیلئے بھی لوہے کا مغز چاھئیے۔ گوشت کا مغز ہو تو شراب میں بھن کر رہ جاتا ہے"

"کیا نام بتایا تھا آپنے اپنا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"وہ بیکار ہے۔ اس نام سے مجھے کوئی نہیں جانتا" ایڈیٹر نے کہا۔

"پھر کس نام سے جانتے ہیں؟"

"میں جلیل نیشاپوری کے نام سے سیاسی کالم لکھتا ہوں — ڈ۔ڈ۔ڈلیا ڈھو کے نام سے مزدوروں کسانوں اور طالبعلموں کی باتیں اور خطیب کرشنے کے نام سے 'بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار'۔۔۔"

"اس میں کیا ہوتا ہے؟" اب لڑکی کی نظروں میں اسکے لئے عقیدت ابھر آئی تھی۔

"ایسی دردناک خبریں" ایڈیٹر نے لڑکی کے سینے پر بچے کی طرح سر رکھتے ہوئے کہا "جنہیں پڑھ کر آنسو نکل آئیں"۔

لڑکی پیار سے اسکے سر پر ھاتھ پھیرنے لگی۔ کمرے

میں شراب اور اسپرے کی مہک ابھی تک بسی ہوئی تھیں جنہیں کھڑکی سے آنے والا ہر جھونکا تھوڑی دیر کیلئے منتشر کر جاتا تھا۔ سفید ھلکے پردے میں سے چاند آکاش پر چلتا ھوا لگ رہا تھا۔ ایڈیٹر خراٹے لے رہا تھا۔ وہ ان تمام آن پڑھ زمینداروں اور بڑےبڑے پیٹ والے رئیسوں سے کتنا مختلف تھا جنکا ایک جملہ بھی صحیح نہیں ہوتا ہے اور جو اپنی اس کاروبار میں لگائی ہوئی رقم کی ایک ایک پائی اس تھوڑی سی دیر میں وصول لینا چاھتے ہیں — بغیر دوسروں کے جسم اور کپڑوں کی پروا کئے ہوئے۔ اس آدمی کا جسم اکہرا تھا، لہجہ درست اور علم انینت — معلوم نہیں اس وقت سوتے میں بھی وہ کیا سوچ رہا ہو — اپنے اُس آخری کالم کیلئے کوئی دکھ بھری کہانی ---

وہ جیٹ کی آواز پر چونک اٹھی جسکے چھت پر سے گذر جانے سے پورا مکان اور کھڑکیوں کے شیشے جھنجھنا اٹھے تھے۔

اسکا بازو ایڈیٹر کے کندھے کے نیچے دبا دبا سو گیا تھا۔ اسنے آھستگی سے ایڈیٹر کا سر اٹھاکر تکئے پر رکھ دیا اور اپنی طرف کے پلنگ پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ صبح ہونے میں ابھی دیر تھی اور گھر کے اپنے پلنگ اور شورشرابے سے یہ جگہہ بہرحال بہتر تھی۔

لڑکی جلدہی گہری نیند میں ڈوب گئی۔

جب وہ چونکی تو اندر کے دروازے پر ستّار دستک دے رہا تھا۔ اسے یاد آیا ایڈیٹر نے کہا تھا 'جانے سے پہلے مس صاحب کو ایک پیالی چائے بھی پلا دینا'۔ شاید وہ چائے لیکر آیا تھا۔

باوجود چائے کی خواہش نہ ہونے کے مجبوراً اسے بستر چھوڑنا پڑا کیونکہ ٦ بجنے والے ہونگے۔

Scanned by CamScanner

وہ تھکے ہوئے قدموں، ٹوٹتے ہوئے بدن، اور مند ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دروازے تک پہنچی۔ واقعی وہی چیز وہاں موجود تھی جس میں ایڈیٹر نے کہا تھا دھاں کوئے جاتے ہیں۔ اوکھلی۔ اتنا بے وقوف نہ ہوتا تو اسکے لئے چائے لیکر کیوں آتا۔ صبح جب اسکے جانے کے بعد ایڈیٹر سوکر اٹھتا تو وہ کونسا اسکے بارے میں پوچھتا کہ مس صاحب چائے پی کر گئی تھیں یا بغیر پئیے؟ اور کہاں گئی تھیں؟ اور اگر پوچھتا بھی اور کہہ دیتا 'ہاں' تو کونسا بعد میں ایڈیٹر اس سے بھی پوچھتا۔

چائے کی پیالی اسے تھما کر ستار واپس چلا گیا۔ لڑکی چائے پینے کیلئے کمرے میں چلی آئی۔ ایڈیٹر نے دوسری طرف کروٹ لے لی تھی، اور اسکا ننگا جسم چادر سے باہر نکل آیا تھا۔ اسکے اسٹول پر رکھے ہوئے کاغذات صبح کی ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔

وہ چائے ختم کرنے والی ہی تھی کہ دور سے وہی پہچانی ہوئی آواز آئی

پپ، پپ پپ، پپ، پپ۔

وہ پیالی زمین پر رکھکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ تیزی سے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جاکر اسنے ایک لمحے میں بریزئیر جسم پر مڑھ لی، پھر ایڈیٹر کے جسم کو چادر سے ڈھکا کیونکہ ہوا میں خنکی تھی۔ باہر کار کے ٹھہرنے کی آواز آئی اور اب وہی آواز نزدیک سے سنائی دی۔

جب وہ الماری کے پاس سے گذر رہی تھی تو اسکی نظر نارنجی رنگ والے ڈبے پر پڑی جس پر بہت خوبصورتی سے سرخ پھول اور پتے پینٹ کئیے گئے تھے، اور سفید ڈھکنے پر ایک عورت کی تصویر بھی بنی ہوئی تھی۔

باہر نکلنے سے پہلے اسنے پھر ڈبی سے اسپرے بٹن

Scanned by CamScanner

دباکر اپنی بغلوں اور سینے پر اسکی پھوار ڈالی اور پھر چہرے پر۔

اسکے ساتھ ہی اسے کھانسی کا دھسکا اٹھا۔ اور آنکھوں میں اندھیرے کی کرنیں سی بننے بگڑنے لگیں۔

نیگرو ڈرائیور نے ـــ جس کا نام جاننے کیلئے محض شیدی کہنا کافی ہوتا ـــ تیسری بار قدرے زور سے ھارن دیا پیپ، پیپ پیپ، پیپ ـــ جیسے وہ غصّے میں ہو۔

لڑکی لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور چھینکتی ہوئی باہر کے گیٹ تک آئی۔ اسپرے کی پھوہاروں نے جیسے اسے اندھا کردیا تھا۔

اسنے دیکھا ایک سفید مٹی کے رنگ کی کتیا سنّ سان سڑک پر اپنے دھیان میں کہیں آہستہ آہستہ دوڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور اسکے تھن دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کو ہل رہے تھے۔ جیسے اتنے سویرے وہ کچھ ڈھونڈھنے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

شیدی ڈرائیور نے ھاتھ بڑھاکر اسکے لئیے پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔ دور سے ایک جیپ آتی ہوئی دکھائی دی

”جلدی کرو“ ڈرائیور نے خفگی سے کہا۔

لڑکی چھینکتی ہوئی کار کی بچھلی سیٹ پر گر پڑی اور آنکھیں ملتی ہوئی ڈرائیور سے بولی

”پتہ نہیں مجھے کیا ہونا جا رہا ہے“ ـــ ”میں ٹھیک تو ہوں نا؟“

لیکن اسے خود اپنی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

میر ظہیر عباس روستمانی

Scanned by CamScanner

ڈرائیور تیزی سے گیئر بدل رہا تھا اور جب اسٹیئرنگ وھیل کے تیزی سے گھمائے جانے اور پہیوں کی آوازیں اور انجن کا شور اسکے زخمی احساسات کے شور اور کھانسی کو نگلنے کی کوشش کر رہے تھے اور اردگرد کی دنیا اسے بمشکل اپنی دکھتی ہوئی آنکھوں سے دکھائی دے رہی تھی تو اس نے کراہتے کہا

"اسنے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ مینے اسکا کیا بگاڑا تھا!"

———

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups
/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

سفید آدمی کی دنیا

اُن دنوں میرے دماغ میں بہت سی باتیں جمع ہوگئیں تھیں ۔ اب بھی ہیں۔ میرا خیال ہے ہم سب ہی بچوں کے دماغ میں بہت سی باتیں تھیں جنہیں ہم کبھی کبھی آپس میں تو ایک دوسرے سے پوچھ لیتے تھے لیکن بڑوں کے پاس یا تو ہماری باتوں کیلئے وقت نہیں تھا یا اگر وہ اُن باتوں کا جواب دیتے بھی تھے تو ممکن ہے وہ خود اپنے جواب سے مطمئن ہوجاتے ہوں لیکن ہم جانتے تھے اُنہیں اصل جواب کا پتہ نہیں ہے۔

مثلاً: یہی سوال کہ مرنے کے بعد جب آدمی کو ایک بڑا سا کھڈا کھودکر اس میں رکھ آتے ہیں اور اوپر سے مٹّی ڈال دیتے ہیں تو وہاں اسکے پاس کون آتا ہے؟ فرشتے؟

لیکن میں جانتا تھا اول تو فرشتے نہ ہم نے دیکھے ہیں نہ ہی اُنہوں نے دیکھے تھے اور پھر جب کسی کو ہر طرف سے بند کردیں گے اور وہ بھی لکڑی کے ڈبے میں بند کر کے اِس پر مٹّی ڈال آئینگے تو فرشتہ کیسے اندر جائے گا اور اسے کیسے آسمانی باپ کے پاس لے جائیگا۔ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں۔

Scanned by CamScanner

میری بڑی بہن جو پڑھنے کی بہت شوقین ہے
ہر وقت پیٹ کے بل لیٹ کر کہانیوں کی کتابیں پڑھتی رہتی
ہے۔ کبھی کبھی جب ہماری بول چال ایک دوسرے سے بند
نہیں ہوتی ہے تو وہ کوئی کہانی مجھے بھی سنا دیتی ہے
اور میری چھوٹی بہن کو بھی۔ اسکے پاس کتابوں کی پوری
لائبریری ہے۔ اب تو کچھ کتابیں میں نے بھی جمع کرلی
ہیں اور جب کبھی ہمارا گھر ہوگا ــــ ممی اور پپا ہمیشہ
کہتے ہیں ایک نہ ایک دن تو کہیں گھر بناکر رہنا ہی ہے ــــ
تو میں بھی اپنی لائبریری بناؤنگا۔

میری بہن کی کتابوں میں زیادہ تر ایسے ناول ہیں
جن میں جاسوسی کرنے والے بچوں کے کارنامے ہوتے ہیں یا
پھر ایسی کہانیاں جن میں دو چار آدمی مل کر، اور ان
میں ایک عورت ضرور ہوتی ہے، کسی مہم پر جاتے ہیں
جیسے انہیں وہ کام کرنے کو کسی نے دیا ہو، کسی حکومت
نے، اور وہ آخر میں کسی بڑی سی بلڈنگ یا پل کو ڈائینامائیٹ
سے اڑاکر واپس اپنے گھر آجاتے ہیں۔

حکومت کیا ہوتی ہے یہ مجھے اُن دنوں بھی معلوم
نہیں تھا اور ابھی بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا ہوں۔
بس کوئی چیز ہوتی ہے اور وہ بڑے لوگوں سے کام کرواتی
ہے، بچوں سے نہیں ــ پپا کا ٹرانسفر بھی حکومت کرتی
ہے اور، اور بہت سے کام ہیں جو حکومت کرواتی ہے لیکن
وہ میں بعد میں بتاؤنگا۔

تو بات یہ تھی کہ میری بہن کے پاس بہت سی کتابیں
ہیں جن میں سب سے زیادہ اینڈبلائیٹن کی ہیں۔ کبھی کبھی
تو اسکی اور ممی کی بحث بھی ہوجاتی ہے، وہ کہتی ہے
اینڈبلائیٹن سے اچھی کہانیاں کسی نے نہیں لکھیں اور سب

Scanned by CamScanner

سے اچھی کتاب ھائیڈی (Heidi) ھے، لیکن ممی کہتی ہیں دنیا میں اور بھی بڑے بڑے لکھنے والے ہیں جیسے ٹالسٹائی، ٹامس مان، ڈوسٹوفسکیڈو ـــ آسکا نام مجھے کبھی ٹھیک سے یاد نہیں ہوا ـــ لیکن اس کی ایک کہانی مجھے ممی نے سنائی تھی اور میرا خیال ہے وہ کہانی خاصی اچھی تھی جس میں ایک بڑھیا کنجوس عورت ہوتی ہے اور ایک پڑھنے والا لڑکا جس کے پاس کھانا کھانے کیلئے اکثر دام نہیں ہوتے تھے اور وہ اس بڑھیا سے اپنی چیزیں بیچ کر دام لیا کرتا تھا۔ پھر وہ اسے پلان بناکر مار ڈالتا ہے اور کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ بڑھیا کو کس نے مارا ہے۔ لیکن پھر وہ لڑکا آخر میں خود ہی سب کو بتا دیتا ھے کہ بڑھیا کو میں نے مارا تھا۔ اس کہانی کا نام ہے ”جرم اور سزا“ اور اسکو سنتے میں مجھے اپنی دادی کی شکل نظر آنے لگتی ہے جو جنوبی افریقہ میں پریٹوریا میں رہتی ہیں۔

مجھے اس بڑھیا سے نفرت ھے، وہ اپنے گھر میں اکیلی رہتی ھے اور اسکا گھر ایسے علاقے میں ھے جہاں بس بہت امیر آدمی رہ سکتے ہیں۔ وہ کہتی ھے 'اس کے علاقے میں نہ افریقہ کے لوگ ہیں نہ ایشیا کے۔ صرف گورے لوگ ہیں'۔

یہی وجہ ھے کہ مجھے وہ بڑھیا زہر لگتی ھے۔ ویسے بھی اسنے مجھے کبھی کچھ نہیں دیا۔ ایک مرتبہ بہت پہلے جب ہم چھٹیوں میں پریٹوریا گئے تھے تو اسنے مجھے بیٹری سے چلنے والا ایک جیٹ ائیرپلین دیا تھا جس میں سے ٹیک آف کے وقت کی آواز نکلتی تھی اور شاید اسٹار بورڈ سائیڈ کے ونگ میں ہری بتی جلتی تھی اور پورٹ سائیڈ والے میں سرخ ـــ وہ تھوڑی دور تک زمین پر چلتا تھا اور پھر رکنے کی آواز یعنی ایئربریکس لگانے کی آواز کے ساتھ ٹھہر جاتا تھا۔

Scanned by CamScanner

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں بہت چھوٹا تھا
لیکن جب بھی ہم اس سے ملنے جاتے ہیں آج تک وہ مجھے
وہی جیٹ یاد دلاتی ہے اور کہتی ہے

"Remember youngman the beautiful jet-plane I gave you? Where is it now?

تم نے اسے ٹھیک سے رکھا ہے؟"

اور پپا کے اشارے پر مجھے سر ہلاکر 'ہاں' کہنا پڑتا ہے کہ وہ ہوائی جہاز ابھی تک میرے پاس بالکل ٹھیک ٹھاک رکھا ہے۔ حالانکہ مجھے اب اسکی شکل تک یاد نہیں ہے اور نہ ہی یہ کہ ہری بتی کس طرف تھی اور سرخ کس طرف۔

بڑھیا میری ماں سے ہمیشہ پوچھتی ہے "تم لوگ بالآخر کہاں سیٹل ہوگے؟"

سیٹل کا مطلب میں بھی جانتا ہوں: کسی ایک جگہہ گھر بناکر ہمیشہ وہیں رہنا، جیسے بڑھیا خود رہتی ہے۔ وہ پوچھتی ہے آسٹریلیا میں؟ کینیڈا کیوں نہیں؟ ہینک کیلئے تو یونائیٹیڈ اسٹیٹس میں بھی فوراً جگہہ نکل آئیگی۔

ہینک میرے باپ کا نام ہے۔

میرے دادا ڈچ تھے، دادی ایفریکانیر ہے۔ اور شاید دونوں زندگی بھر ایک دوسرے کے خلاف رہے، میں نے سنا ہے میرے دادا نے اپنی عمر کا بڑا حصہ انڈونیشیا میں گذارا تھا تاکہ وہ بڑھیا سے دور رہ سکیں، میں نے ممی اور پپا کو کھس پھس کرتے اکثر سنا ہے کہ میرے دادا بعد میں کسی ایسی، عورت کے ساتھ رہنے لگے تھے جو گوری نہیں تھی

اور یہ بھی اُن باتوں میں سے ایک ہے جو میرے دماغ میں اُن دنوں بھری ہوئی تھیں کہ دادا نے ایسا کیوں کیا اور اگر کیا بھی تھا تو اس میں حرج ہی کیا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے حکومت نے انہیں یا یہ کہ اُس عورت کو جنوبی افریقہ میں انکے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی تھی اور ایک بار جب وہ ڈربن میں اسکے ساتھ ٹیکسی میں کہیں جارہے تھے تو دونوں کو پولیس اسٹیشن پکڑکر لے جایا گیا تھا کیونکہ دونوں کی رنگت فرق تھی اور اس بات کے حکومت خلاف تھی۔ حالانکہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہاں نیگرو عورت کے ساتھ، کوئی انڈین مرد یا نیگرو مرد کے ساتھ، کوئی برٹش عورت جہاں چاہے جاسکتے ہیں، مووی دیکھنے، سرکس میں، یا بانہوں میں بانہیں ڈال کر ٹہلنے بھی جس طرح ممی پپا اکثر شام کو اندھیرا ہونے سے پہلے ٹہلنے جاتے ہیں اور یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں اور میں جب بڑا ہوجاؤنگا اور شادی کرونگا تو اسی طرح اپنی بیوی کے ساتھ کبھی کبھی باہر نکلا کرونگا — ممی کی طرح اس کا ہاتھ میری کمر پر لپٹا ہوگا اور میرا ہاتھ اسکی گردن کے پیچھے سے جاکر اسکے دور کے کندھے پر ہوگا۔ لیکن میں یہ بھی سوچتا ہوں اگر وہ مجھ سے لمبی ہوئی تو پھر شاید ایسا نہ ہو سکے —

بہر حال حکومت ساؤتھ میں بھی ہے — ممی، پپا جنوبی افریقہ کو صرف ساؤتھ کہتے ہیں — اور اس ملک میں بھی ہے جہاں ہم رہتے ہیں۔

ایک دفعہ میں نے دادی کو ہانپتے ہوئے — جیسے وہ اپنا غصہ دبا رہی ہوں — پپا سے کہتے ہوئے سنا تھا

Scanned by CamScanner

"مجھے ذرّا برابر بھی یہ فکر نہیں ہے کہ تمھارا باپ کہاں ہے، یا کہاں مرا۔

He was low and that is what he proved by living with a dark woman.

Sin or no sin, the thing of any import is that he lived with a dark woman!"

(وہ گرا ہوا آدمی تھا اور یہی اسنے ایک اندھیری عورت کے ساتھ رہ کر ثابت کر دکھایا)۔

ڈارک کا مطلب میری سمجھ میں یہی آتا ہے لوگ اندھیرے سے ڈرتے ہیں اور ہر اس چیز سے جو اندھیرے کی طرح کالی ہو، اسکول کے پلیز میں میں نے شیطان کو کالے کپڑے پہنے اور منہ پر کالک ملے ہوئے دیکھا ہے، جہاں ہم رہتے ہیں افریقہ میں اسے بھی پہلے اندھیرا براعظم کہا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے لوگ پہلے جب وہ پہاڑوں میں بڑے بڑے کھنڈروں میں رہتے تھے اور بجلی وغیرہ نہیں تھی تو رات کو ڈر کے مارے باہر نہیں نکلتے ہونگے جیسے آج بھی جس چھوٹے سے شہر میں ہم رہتے ہیں اور جہاں بجلی نہیں ہے لوگ رات کو باہر نہیں نکلتے ہیں کیونکہ راستے میں سانپ ہوتے ہیں اور اتنے بڑے بچھو کہ میرے دونوں ہاتھوں سے بھی بڑے ہوتے ہیں اور پھر انہیں اندھیرے میں شیر بھیڑیوں کا بھی ڈر رہتا ہوگا۔ لیکن خود مجھے اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا ہے اسی لئیے میں کالے لوگوں سے بھی نہیں ڈرتا ہوں۔

ایک دن میں نے پپا سے جب ہم صبح صبح ٹہلنے جارہے تھے اور میری کتیا مشکا میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی پوچھا:

"ڈیڈ۔ ہم ساؤتھ میں کیوں نہیں رہتے ہیں؟"

ڈیڈ نے نیم کے پھل اپنی ٹہلنے کی چھڑی سے میرے لئیے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"تم وہاں رہنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں۔ پھر بھی"۔

میں خاموشی سے پھل کھانے لگا اور مشکا نبولیوں کو سونگھ کر جھاڑی میں کسی جانور کا پیچھا کرنے لگی۔ شاید اسے کوئی جنگلی چوہا وہاں نظر آیا ہوگا۔

ایک بار پھر میں نے پوچھا

"ڈیڈ، گرینڈپا واقعی گرے ہوئے آدمی ہیں؟"

"نو"۔ پپا نے ایسے لہجے میں جواب دیا کہ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں دل سے کہہ رہے ہیں۔

"تمہارے گرینڈپا گرے ہوئے نہیں بہت بڑے آدمی تھے"۔

وہ کچھ دیر رک کر دوبارہ بولے "تھے، اس لئیے کہ وہ اب دنیا سے جا چکے ہیں"۔

میری سمجھ میں نہیں آیا ایسے موقع پر بڑوں کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے میں انکے سر کو تھپتھپا نہیں سکتا تھا اور نہ ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ آپ جھکئیے تاکہ میں آپ کے سر کو تھپتھپا سکوں جس طرح آپ میرے، ڈینا یا فیونا کے افسردہ ہونے پر کرتے ہیں۔ نہ ہی میں ان سے کہہ سکتا تھا 'رنج مت کیجئیے'۔

صبح بہت اچھی تھی مشکا دوبارہ میرے ساتھ چل رہی تھی اور سورج ہمارے داہنے طرف کی وادی میں کھرے کے پیچھے ابھر آیا تھا۔

یکلخت میں نے پوچھا "ڈیڈ۔ گرینڈ پا کے ساتھ اس

دوسری عورت کو ساؤتھ میں رھنے کی اجازت حکومت نے کیوں نہیں دی تھی؟"۔

ڈیڈ نے جھینپتے ہوئے کہا "شاید اس لئیے کہ وہاں جگہہ کم ہوگی"۔

مجھے معلوم تھا وہ جھوٹ بول رہے ہیں کیونکہ رات کو ممی اکثر اپنا میڈیسن کا رسالہ پڑھتے ہوئے ڈیڈ سے کہتی ہیں:

"Here is another: one of those ads–Emigrating to South Africa"?

(یہ رہا ایک اور ایڈورٹزمینٹ۔ آپ جنوبی افریقہ بسنے کیلئے جارہے ہیں؟)

یہ اشتہار جو لندن سے آنے والے اس رسالے میں ہمیشہ چھپتا ہے۔ میں نے بارھا سنا ہے

'اگر آپ جنوبی آفریقہ، آسٹریلیا، کینیڈا یا یونائٹیڈاسٹیٹس بسنے کیلئے جارہے ہیں تو ہم آپ کا سامان پیک کرانے اور وہاں بھیجنے میں آپ کی مدد کرسکتے ہیں'۔

ایسا لگتا ہے ساری دنیاکو جنوبی افریقہ میں بسنے کیلئے بلایا جارہا ہے اور صرف میرے دادا اور اس اندھیری عورت کیلئے وھاں جگہہ کی تنگی تھی۔

یہ ایک طرح سے ہمارا گھریلو مزاق ہے جیسے ھرگھر میں ایسی دوچار باتیں ہوتی ہیں جن کا ذکر آجانے پر لوگ ہنس پڑتے ہیں۔

ایسے موقع پر ممی اور پپا دونوں ہنس پڑتے ہیں اور چھوٹی فیونا بھی حالانکہ وہ بالکل بیوقوف ہے اور اسے دادی سے ملنا بھی یاد نہیں ہے۔ کبھی کبھی ایسے موقع پر ڈیڈ کے منھہ سے ایک لفظ نکلتا ہے 'ھپوکریٹ'

ممی نے پوچھنے پر بتایا تھا 'ھپوکریٹ ایسے آدمی کو کہتے ہیں جس کے دل کے اندر کچھ اور ہو اور باتیں وہ کچھ اور کرتا ہو'۔

لیکن فیونا ابھی تک ھپوکریٹ کو ھپّو ھی کی قسم کا کوئی بڑا جانور سمجھتی ہے۔ بلکہ ھپّو سے بھی بڑا جو یہاں دریاؤں میں عام ہیں اور کبھی کبھی کشتی بھی اُلٹ دیتے ہیں۔

تو اس صبح جب میں اور پپا اور مشکا سیر سے واپس آرہے تھے میں نے اچانک کہا "ڈیڈ اگر بڑا ہو کر میں کسی نیگرو یا اندھیری لڑکی سے شادی کروں تو یہ بری بات ہوگی؟"

پپا نے ہنستے ہوئے کہا "نہیں یہ بری بات تو نہیں ہوگی۔ تمہیں اندھیری لڑکیاں اچھی لگتی ہیں؟"

میں نے سر ھلاکر 'ھاں' کیا۔

انہوں نے مجھ سے چھیڑنے والے لہجے میں پوچھا "پھر کبتک ارادہ ہے؟"

میں نے کہا "ابھی میرا ارادہ نہیں ہے"۔

ہم دونوں ھنس پڑے۔

ہم اس شہر یا قصبے میں کب آئے یہ بھی ایک اچھی خاصی کہانی ہے۔ پپا کا ٹرانسفر سیرالیون سے یہاں کا ہوا تھا اور ہم لوگ کچھ عرصہ اس ملک کے کیپیٹل میں ایک ہوٹل میں رہے تھے۔ ساؤتھ کی طرح اس شہر کو بھی سب لوگ صرف کیپیٹل ہی کہتے ہیں اور پتہ چل جاتا ہے کس شہر کی بات ہو رھی ہے۔

پھر جب پپاکو اس قصبے میں آکر کام کرنے کا حکم

Scanned by CamScanner

حکومت نے دیا تو ہم لوگ کیپیٹل کے ریلوے اسٹیشن پر گئے جو سنسان تھا اور جہاں ایک بڑی سی بگھی جس میں کسی برٹش بادشاہ یا ملکہ نے اس شہر کی سیر کبھی کی تھی، ویٹنگ لاؤنج کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی اور اسکے برابر میں پیتل کی ایک پلیٹ پر کچھ لکھ کر اسے سیمنٹ کے بلاک میں لگایا ہوا تھا۔

ٹینا نے پڑھ کر مجھے بتایا کہ جب یہاں انگریزوں کی حکومت تھی تو ۱۸ سو کتنے میں کون بادشاہ یا ملکہ بگھی میں بیٹھے تھے۔

میں نے مما کو ڈیڈ سے کہتے سنا

"They should do away with these memorabilia"

(انہیں چاہئیے ان یادگاروں کو نکال پھینکیں)۔

انکا آخری لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا اور ہربات میں ٹینا سے نہیں پوچھنا چاہتا، ورنہ وہ واقعی اپنے کو کچھ سمجھنے لگتی ہے۔

بعد میں جب ہم ٹرین کے کمپارٹمینٹ میں بیٹھے تو وہاں ایک سفید عورت بھی پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی جس نے ممی کی طرف دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا اور جو دو مرد اسے ٹرین میں بٹھانے آئے تھے اُن سے بولی

"خدا کا شکر ہے۔ میرا خیال ہے اب میں اطمینان سے سو سکوں گی"

ٹینا اپنی کہانیوں کی کتاب سنبھال کر اوپر کی برتھ پر چلی گئی، فیونا اپنی ناک کھڑکی کے شیشے سے رگڑ رگڑ کر باہر دیکھنے لگی اور میں اس انتظار میں تھا کہ ٹرین چلے تو میں ممی یا ڈیڈ سے باتیں شروع کروں، کیونکہ ٹرین کی آواز

Scanned by CamScanner

میں وہ سفید عورت ہماری باتیں نہیں سن سکے گی اور میں
کھل کر باتیں کروں گا۔

ٹینا کیا پڑھ رہی تھی مجھے معلوم تھا۔ اسکی پڑھی ہوئی کہانیاں کچھ، میں خود اب تک پڑھ چکا ہوں اور کچھ، وہ مجھے سنا چکی ہے۔ اسوقت وہ ٹالسٹائی کی کہانیاں پڑھ رہی تھی اور ان میں سے بھی وہ جس میں پاہم ایک کسان ہے جسکے پاس پہلے بہت تھوڑی سی زمین تھی اور وہ خوش تھا پھر وہ امیر بننے کیلئے اور زیادہ اور زیادہ زمین لیتا گیا کیونکہ اس کے دل میں لالچ آگئی تھی۔ آخر میں وہ باشکروں کے ملک میں جاتا ہے جہاں زمین مفت ملتی ہے لیکن اس کیلئے شرط یہ تھی کہ اسے صبح چل کر سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے جہاں سے وہ چلا تھا وہیں لوٹ کر آنا ہوگا اور اس چکر لگانے میں وہ جتنی زمین گھیرلے گا اتنی اسکی ہوجائیگی۔ لیکن شیطان نے اسکے دل میں لالچ بھردی کہ آج زیادہ سے زیادہ زمین پر قبضہ کرنا ہے اور وہ دن بھر اتنا چلا اتنا چلا کہ شام کو جب وہ واپس باشکروں کے سردار کے پاس پہنچا تو ٹھیک اسی وقت سورج ڈوب گیا اور وہ باشکروں کے سردار کے پاس پہنچ کر زمین پر گر پڑا۔ سردار نے کہا "یہ ہے آدمی — اس نے تو بہت زمین حاصل کرلی"۔ لیکن جب پاہم کو اس کے نوکر نے اٹھانا چاہا تو اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور پاہم مرچکا تھا۔ پھر اس کے نوکر نے اس کیلئے کھڈا کھودا، اور جس طرح ٹینا کہتی تھی

"سر سے لیکر پیر کی انگلیوں تک صرف ۶ فٹ زمین حقیقت میں اسے چاھئیے تھی"۔

یہ جملہ کہتے وقت ٹینا، ایسا لگتا تھا، چرچ میں

پلپٹ pulpit پر کھڑی ہو کر اتوار کی صبح کا وعظ سُنا رہی ہے اور میں شاید ہاہم کی طرح کے لالچی لوگوں میں سے ہوں اور سر جھکائے اس کے سرمن کو سن رہا ہوں۔ اس کہانی کا نام تھا

"ایک آدمی کو کتنی زمین چاھئیے"

یہ فیصلہ میں کب کا کر چکا تھا کہ کہانی سنانے میں ٹینا کچھ گڑ بڑ کرتی ہے یا وہ آگے چل کر چرچ کی زندگی اختیار کرے گی۔ اور ایک نہ ایک دن یہ کہانی مجھے خود پڑھنی ہے کہ واقعی ایک آدمی کو کتنی زمین چاھئیے ہوتی ہے۔

ٹرین چلنے ہی والی تھی کہ ایک ایشین عورت بچے کو گود میں سنبھالے ہوئے تقریباً بھاگتی ہوئی ھمارے کمپارٹمینٹ کی طرف آئی، اس کے پیچھے پیچھے اسکا نیگرو نوکر لڑکا ایک ذرا بڑے بچے کو گود میں سنبھالے ہوئے تھا اور ایک میری ہی عمر کی لڑکی قلی سے باتیں کرتی ہوئی کمپارٹمینٹ میں داخل ہوئی۔

سفید عورت نے اس قافلے کو دیکھ کر گھبراھٹ سے پہلے تو "او-نو!" کہا تھا لیکن جب وہ ایشین عورت قلی سے انگریزی میں بات کرنے لگی تو سفید عورت کی گھبراھٹ کچھ کم ہو گئی۔

قلی سامان اندر رکھ کر چلا گیا۔ ایک برتھ ایشین عورت اور اسکے بچوں نے سنبھال لی اور اسی برتھ پر ایک کونے میں نیگرو نوکر بیٹھ گیا۔

اب ٹرین نے چلنے کی آخری سیٹی دی۔

سفید عورت نے گھبراھٹ اور غصے کے ملے جلے

جذبات سے نیگرو نوکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایشین عورت سے کہا "یہ اس کمپارٹمینٹ میں تو نہیں رہے گا؟"

ایشین عورت نے انگریزی میں کہا "اس کی سیٹ بھی اسی کمپارٹمینٹ میں ریزروڈ ہے"۔

"نہیں۔ یہ اس کمپارٹمینٹ میں سفر نہیں کرے گا" سفید عورت نے سخت لہجے میں کہا اور ٹرین روکنے کیلئے نیگرو گارڈ سے جو ہمارے کمپارٹمینٹ کے سامنے ہی کھڑا ہو کر ہری جھنڈی ہوا میں بلند کر رہا تھا، حکم چلانے والی آواز میں کہا۔

"Stop the train — — please"

نیگرو گارڈ نے ہری جھنڈی فوراً نیچے کردی، بغل سے لال جھنڈی نکال کر ہوا میں لہرائی، اور ہمارے کمپارٹمینٹ کے پاس آگیا۔

ٹرین روانہ ہونے کی جو چرچراہٹ بوگیز میں پیدا ہوئی تھی ایکدم رک گئی۔ اس کے بعد ایشین عورت اور سفید عورت میں بحث ہونے لگی۔ نیگرو لڑکا بے بسی سے اپنے کونے میں دبکا ہوا تھا اور ریلوے گارڈ بے بس سا لگ رہا تھا۔

ایشین عورت نے کہا "میں بیمار ہوں اور نوکر کو اپنے ساتھ رکھنے کیلئے میں نے اسکا ٹکٹ اسی کلاس کا بنوایا ہے تاکہ وہ بچوں کی دیکھ بھال کرسکے"۔

"نہیں یہ اس کمپارٹمینٹ میں سفر نہیں کر سکتا" سفید عورت نے اس طرح کہا جیسے وہ اپنے نوکر سے بات کر رہی ہو۔

"کیوں نہیں؟" ایشین عورت نے بھی اسی کے لہجے میں پہلی بار کہا۔

"اس لئے کہ — اس لئے کہ —" وہ کچھ کہتے کہتے

رک گئی اور پھر بولی "اس لئے کہ نوکروں کیلئے درجہ علیحدہ ہونا ہے"۔

حالانکہ مجھے معلوم تھا وہ دراصل کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی یعنی 'اس لئے کہ تمہارا نوکر نیگرو ہے'۔ لیکن یہ بات وہ ایک نیگرو ملک میں رہ کر کیسے کہہ سکتی تھی!

ایشین عورت نے کہا "میڈم آپ چاہیں تو اپنا کمپارٹمینٹ بدل سکتی ہیں۔ ویسے بھی وہ آپکی جگہہ نہیں لے رہا ہے"

سفید عورت نے ممی کی طرف دیکھا جیسے وہ چاہتی ہو وہ بھی اسکی طرف سے بولیں لیکن پپا ایشین عورت کی بچی سے کھیلنے لگے اور ممی نے اپنے پرس میں سے نکال کر مع ایشین عورت کے بچے اور اس نیگرو لڑکے کے سب بچوں کو چاکلیٹ کے ٹکڑے توڑ توڑ کر دینے شروع کر دیئے۔

مجھے معلوم تھا ممی کا یہ اس عورت کو ایک خاموش جواب تھا۔

سفید عورت کو رونے کا دورہ سا پڑنے لگا۔

اسکے دونوں ساتھیوں نے جو پلیٹ فارم پر کھڑے تھے خفگی سے ہماری طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک اسے چپ کراتے ہوئے سہارا دے کر نیچے اتارنے لگا اور دوسرے نے اسکا سامان اٹھالیا۔ میں نے انہیں کہتے ہوئے سنا۔

"You can go by air mi'daire" (my dear)

لیکن میرا خیال ہے نیگرو گارڈ نے اس عورت کو کسی اور کمپارٹمینٹ میں جگہہ دلوادی ہوگی کیونکہ بعد میں جب ٹرین چلی تو مجھے وہ ہی دونوں مرد اکیلے پلیٹ فارم سے باہر جاتے ہوئے نظر آئے۔

اس چھوٹے سے واقعہ کے بعد ہمارا سفر بہت اچھا گذرا

Scanned by CamScanner

ہم اس قصبے میں پہنچ گئے جہاں نہ بجلی ہے اور نہ ہی پانی نل سے آتا ہے۔ لیکن ممی، پپا، مجھے، ٹینا اور فیونا سب ھی کو یہ جگہ پسند ھے، کیونکہ ہم جہاں چاھیں اکیلے جاسکتے ھیں اور ایسا لگتا ہے کہ قصبے میں سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں، نیگروز، ایشین اور سفید لوگ اور بعض اُن میں سے ایسے بھی ھیں جنکی رنگت چھپکلی کے پیٹ کی طرح پیلی ہوتی ہے اور یہاں نیگروز والے چھوٹے چھوٹے۔ میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے انکی مائیں نیگرو ہیں لیکن باپ جب یہاں انگریزوں کی حکومت ختم ہوئی تو واپس یورپ چلے گئے۔

یہ کیسے ممکن ھے، یہ بھی اُن ہی باتوں میں سے ہے جو میرے دماغ میں جمع ھوگئی ھیں — ایک باپ کس طرح بچوں کو ھمیشہ کیلئے چھوڑ کر جاسکتا ہے! ایک دفعہ جب یہی بات میں نے ٹینا سے پوچھی تو اس نے بڑوں کے لہجے میں کہا " ہے نا تعجب کی بات!"۔

مجھے معلوم تھا وہ میرے سوال کا جواب دینا نہیں چاہ رھی ھے یا یہ کہ اسے خود بھی اسکا جواب معلوم نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بحث طلب باتیں صرف اس وقت کرتی تھی جب اسکے پاس، مجھے خاموش کرنے کیلئے کوئی ایسی نئی بات ہوتی تھی جو اسنے کسی کتاب میں کچھ ھی دن پہلے پڑھی ہو اور یہ بات کرتے وقت اسکا لہجہ بڑے آدمیوں کا سا ہوجاتا تھا۔

ایک دن جب پپا ٹور پر گئے ہوئے تھے اور ممی گھر پر مریضوں کو دیکھ رہی تھیں ٹینا میرے پاس آئی اور کھسر پھسر والی آواز میں بولی

"کسی کو دفن ہوتے ہوئے دیکھنا چاھتے ہو؟"

میں نے بے صبرے پن سے پوچھا "کون مر گیا ہے؟ چلو"۔

اسنے، ہونٹوں پر انگلی رکھکر مجھے خاموش کراتے ہوئے کہا "پپا کی ٹیم کا ایک ڈرائیور"۔

"کونسا؟" میں نے اسی اشتیاق سے پوچھا

"دیکھ کر پتہ چل جائے گا"۔ اسنے مجھے پیچھے پیچھے چلے آنے کا اشارہ کیا۔

اس دن ٹینا کے اسکول کی چھٹی تھی۔ فیونا باہر کتیا سے کھیل رہی تھی اور ہمیں خدشہ تھا دونوں ہی ہماری بو سونگھہ کر ساتھ چل پڑینگے۔ لیکن ٹینا کے ذہن میں پورا پلان پہلے سے تیار تھا۔ اور اس وقت وہ مجھے بہن سے زیادہ اُنہی مہم والی کہانیوں میں سے ایک لڑکی لگ رہی تھی۔

ہم نے سڑک سے ہٹ کر بھٹے کے کھیتوں میں سے راستہ لیا۔ اور قصبے کے ہسپتال میں بھی جو ہمارے گھر سے شاید ایک میل دور تھا باؤنڈری وال کودکر پیچھے سے داخل ہوئے۔

وہ مجھے ہسپتال سے ہٹ کر بنی ہوئی ایک چھوٹی سی سنسان عمارت کے پاس لے گئی جس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اسنے ہر کھڑکی میں سے آچک آچک کر اندر جھانکا اور پھر ایک میں سے مجھے اندر جھانکنے کیلئے کہا۔

وہاں اندر سفید ٹائیلز لگی ہوئی میز پر پپا کا وہ ڈرائیور لیٹا ہوا تھا جسنے کچھ ہی دن پہلے مجھے پالنے کیلئے ایک بندر لاکر دیا تھا۔

میز پر خون پڑا تھا اور ایسا لگتا تھا اس کے سر کے اوپر کے حصئے کو کاٹ کر دوبارہ سوئی دھاگے سے سیا گیا ہے۔

ٹینا نے مجھے بتایا صبح جب اسکی دونوں بیویاں اسے

Scanned by CamScanner

جگانے گئیں تو ڈرائیور بستر میں مرا ہوا پڑا تھا اور اپنے ممی کو کہتے سنا تھا اسکی Autopsy آٹاپسی ہوگی جسکے بعد اسے دفنایا جائے گا۔

میں نے آٹاپسی کے معنی پوچھے حالانکہ اس کیلئے مجھے اپنی شرم پر قابو پانا پڑا۔

ڈینا نے کہا "یعنی یہ کہ اسے کسی نے زہر تو نہیں دیا تھا کہ وہ سونے کا سوتا ہی رہ گیا۔ لیکن ممی کا کہنا ہے اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ اور یہ بات اسکے جسم کو چیر کر چیک کی گئی ہے۔ یہی آٹاپسی ہے اور اس کے بعد اسکے جسم کو دوبارہ سی دیا گیا ہے"۔

میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ڈینا مجھے ڈرتے ہوئے دیکھے۔ دفنانے میں ابھی کافی دیر تھی اس لئیے ہم گھر واپس چلے گئے۔

ایک یا دو گھنٹے بعد ڈینا دوبارہ میرے پاس آئی، اور بولی "چلو"۔

ہم دونوں پھر بھٹے کے کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے اس طرف چل پڑے جدھر مسلمانوں کا قبرستان تھا۔

گھنی جھاڑیوں کے پیچھے سے ہم پورا سین دیکھ سکتے تھے۔ میں نے لوگوں کے درمیان پپا کو بھی مغموم کھڑے دیکھا۔ اور ایک طرح کا اطمینان ہوگیا کہ ہماری یہ چوری پکڑی نہیں جائیگی کیونکہ ہم ممی اور فیونا کو گھرپر سوتا چھوڑ کر آئے تھے۔ اور پپا ہمارے سامنے کھڑے تھے۔

ڈرائیور سفید کپڑے میں لپٹا ہوا ایک تختے پر لیٹا ہوا تھا اور خون اس کپڑے میں سے رس کر باہر آگیا تھا۔

اسکے پاس ہی دو آدمی زمین کھود رہے تھے۔ سرخ مٹی جو وہ بیلچوں سے نکال نکال کر باہر پھینک رہے تھے،

Scanned by CamScanner

اسکی دو پہاڑیاں اس لمبے سے کھڈے کے دونوں طرف بن گئی تھیں۔ اس کے بعد وہ لوگ ایک لمبی لائین میں کھڑے ہوگئے اور اُن میں سے ایک آدمی نے وہ کام کیا جو ٹینا نے مجھے بعد میں بتایا مرنے والے کیلئے آخری سروس تھی۔ یعنی اسکا جو کچھ بھی مطلب ہو۔

سروس کے وقت پپا اور انکے کچھ ساتھی علیحدہ کھڑے رہے اور اسکی جو وجہ ٹینا نے مجھے بتائی وہ میں خود پہلے ہی سے جانتا تھا کہ پپا کرسچین ہیں اور ڈرائیور اور اسکو دفن کرنے والے مسلمان تھے۔

جھاڑیوں میں ہمارے آس پاس گرگٹ پھر رہے تھے لیکن مجھے سرخ چونٹیوں سے ڈر لگ رہا تھا جو بالکل ہمارے آس پاس پھر رہی تھیں۔

بعد میں اُن لوگوں نے ڈرائیور کو مع کپڑے کے اٹھاکر کھڈے میں لٹا دیا اور اسکے اوپر کیلے کے پتے رکھکر دوبارہ وہی مٹی اس پر ڈالنے لگے جو کھودکر باہر نکالی گئی تھی۔ دم بھر میں دونوں سرخ پہاڑیاں غائب ہوگئیں اور انکی جگہہ ایک لمبی سی قبرنے لے لی جسکے چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگ، پپا سمیت، ہاتھ اٹھاکر دعا پڑھ رہے تھے۔

ٹینا نے ایک بار پھر مجھے انھی نظروں سے دیکھا جن سے وہ ہمیشہ یہ دکھانے کی کوشش کرتی ہے جیسے وہ اکیلی دنیا بھر کے بھید جانتی ہے اور آہستہ سے میرے کان میں کہا

"٦ فٹ سر سے لیکر پیر کی انگلیوں تک صرف ٦ فٹ زمین حقیقت میں اسے چاہئیے تھی"۔

یہاں لانے کیلئے میں ٹینا کا شکرگذار تھا لیکن اسکا

چرچ کے پلپٹ پر کھڑے ہو کر وعظ سنانے کا یہ انداز اس وقت بھی مجھے ناگوار گزرا۔

اور شام کو میں نے ڈینا کی موجودگی میں ممی سے پوچھا "واقعی ٹالسٹائی بڑا لکھنے والا تھا"۔

ڈینا کے کان ایک دم سرخ ہو گئے۔

ممی نے کہا "ہاں واقعی میں بہت بڑا لکھنے والا تھا"۔

"جوناس اسپائیری اور اینڈ بلائیٹن سے بھی بڑا؟"

ممی نے سنجیدگی سے کہا "ابھی تو نہیں لیکن جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو شاید وہ بھی تمہارے ساتھ ساتھ جوناس اسپائیری اور اینڈ بلائیٹن ENID BLYTON سے بڑا لکھنے والا بن جائے"۔

"اور جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ سچ ہے؟" میں نے سوال کیا

"ہوں اوں" ممی نے کہا

"اور یہ بھی سچ ہے آدمی کو صرف چھ فٹ زمین چاہئیے ہوتی ہے؟"

"ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بھی صحیح ہے" ممی نے کہا۔

میرا خیال ہے ڈینا کو اس وقت پسینے آرہے تھے لیکن وہ اپنی جگہ پر جمی بیٹھی رہی۔

"پھر —" میں کہتے کہتے رک گیا۔

"پھر کیا؟" ممی نے کریدنے والے لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں" میں نے بات ٹالنی چاہی۔

"نہیں کچھ تو ہے" پپا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

وہ شام سے خاموش تھے۔ ڈرائیور کی اچانک موت

Scanned by CamScanner

نے ظاہر ہے اُن پر گہرا اثر کیا تھا۔ ڈرائیور اور وہ لمبے لمبے سفر پر ساتھ جاتے رہتے تھے، اور وہ بھی اُن جنگلوں میں جہاں اکثر دن میں بھی اندھیرا رہتا ہے جہاں جنگلی جانوروں کا بھی خطرہ ہوتا تھا اور مخالف قبیلے والوں کا بھی جو ڈرائیور کو اس کے چہرے کے نشانوں سے پہچان کر مار ڈالتے۔ ایسے موقع پر پپا کار خود چلانے لگتے تھے اور ڈرائیور نیچے کار کے فرش پر بیٹھ جاتا تھا۔ کبھی کبھی کھانا ختم ہوجانے پر وہ پپا کے کھانے میں سے بھی کھا لیتا تھا بشرطیکہ اس میں سؤر کا گوشت نہ ہو اور اپنا کھانا ختم ہوجانے پر پپا اسکا کھانا کھا لیتے تھے۔

مجھے معلوم ہے میری ہی طرح وہ بھی اداس تھے کیونکہ شام کو وہ اور میں دونوں ہی ڈرائیور کے دئیے ہوئے بندر کی پیٹھ سہلاتے رہے تھے۔

پھر میں ایک دم جیسے پھٹ پڑا

"یہ سب جھوٹ ہے، سب جھوٹ ہے"۔

ممی اور پپا ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا جھوٹ ہے؟" ممی نے رسانیت سے مجھ سے پوچھا

"جو ٹالسٹائی نے لکھا ہے" میں نے غصّے سے کہا۔

"کوئی خاص بات ہوئی ہے؟" ممی نے ٹینا سے پوچھا۔

ٹینا نے اپنا سر جھکا لیا۔

"اوکے - اوکے - ہم کھانے کے بعد بات کریں گے" پپا نے کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا میں رو رہا ہوں یا غصّے میں ہوں۔ اور اگر غصّے میں ہوں تو ٹالسٹائی پر یا ٹینا پر۔ اور اگر رو رہا ہوں تو ڈرائیور کی موت پر یا کسی اور بات پر۔

میرے دماغ میں دادی، وہ سفید عورت جس کا ہمارا ساتھ

تھوڑی دیر کے لئے ٹرین میں ہوا تھا اور نجانے کتنے ہی دوسرے لوگ آ رہے تھے۔ اتوار کی صبح کے سرمن کے الفاظ اور خاص طور پر وہ باتیں جو پچھلی چھٹیوں میں میں نے رات بھر کے سفر میں پریٹوریا سے ڈربن آتے ہوئے کار میں سنی تھیں، جب ہم دادی سے مل کر واپس آ رہے تھے، اور چلتے وقت دادی نے پپا سے کہا تھا

"ھینک، تم جب چاہو یہاں واپس آ سکتے ہو۔ یہ وہ اکیلا ملک ہے دنیا بھر میں جس کے ہر بسانے والے کا آئیڈیل یہ تھا کہ جب وہ اپنے مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھے تو اسے اپنے سب سے نزدیک کے پڑوسی کی چمنی سے اٹھتا ہوا دھواں نظر نہ آئے"۔

اس رات پپا کا ایک ساتھی کار چلا رہا تھا۔ پپا اگاڑی سیٹ پر بیٹھے تھے اور ممی، میں، فوونا اور ٹینا پچھلی پر۔ رات کے اندھیرے میں ایسی سڑک پر جس پر میلوں تک ایک بھی جھٹکا نہ لگے کس کو نیند نہیں آ جائیگی۔

باہر وہ پہاڑیاں جو دن میں مخمل کی طرح کی ہری گھاس میں لپٹی نظر آتی ہیں، اس وقت اندھیرے میں چھپی ہوئی تھیں اور کار کی ہیڈ لائیٹس سے کبھی کبھی ان کا کوئی کونا چمک اٹھتا تھا۔

ہم جانے پہچانے شہروں سے گزر رہے تھے، کولینزو، لیڈی اسمتھ، پیٹر میرٹس برگ —— سب شہر خاموش تھے۔

ہر سفید ایفریکانیر کسان کا گھر آس پاس پھیلی ہوئی اس کی میلوں لمبی زمین کے بیچ میں کھڑا چپ چاپ لگ رہا تھا۔ اور کرال کے ایک کونے پر اس کے نیگرو نوکروں کے چھوٹے چھوٹے سے گھر تھے۔ ایک دوسرے میں گھسے ہوئے۔

میں نے دن میں بھی پیٹر میرٹس برگ کی سڑکوں کو سونسان پایا تھا اور اس وقت تو باوجود اس کے کہ

Scanned by CamScanner

انمیں روشنی تھی مجھے اُن سے ڈر لگ رہا تھا۔ جیسے یہاں لوگ رہتے ہی نہ ہوں۔

ممی باتوں میں حصہ لیتے لیتے سوگئیں، فیونا سفر کے شروع ہی میں سوگئی تھی اور ٹینا کتاب نہ پڑھ سکنے کی وجہ سے زیادہ دیر نہیں جاگ سکی۔

صرف پپا اور ان کا دوست آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے جو میرے لیئے بالکل نئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ کسی عورت نے اپنی ڈائری میں اسوقت یہ لکھا تھا جب وہ لوگ یہاں آ کر بسنے شروع ہوئے تھے کہ "کالوں اور گوروں کی برابری کی پالیسی بائیبل کی تعلیم کے خلاف ہے"۔

پالیسی کیا ہوتی ہے میں نہیں جانتا لیکن مجھے معلوم ہے ہمارے یہاں سرمن میں جو کچھ کہا جاتا ہے یہ بات اسکی اُلٹ تھی۔

اُنکی باتوں میں یہ ذکر بھی آیا کہ کالوں اور گوروں کے لئیے برابر حقوق خدا کے قانون کے خلاف بات ہے۔ اور یہ کہ یہاں کے سفید لوگوں کا یہ پکا یقین تھا کہ "زیادہ سے زیادہ زمین کا حاصل کرنا ہر آزاد آدمی کا حق ہے"۔

میں اُنکی اکثر باتیں پوری طرح نہیں سمجھ رہا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح مجھے پپا کی باتیں سننے میں مزا آ رہا تھا۔ اور اُن کا دوست بھی اُن ھی کی طرح کی باتیں کررھا تھا۔

وہ لوگ آسٹریلیا کے پرانے باشندوں کا ذکر کرتے رہے، اور ریڈ انڈینز کا اور یورپ سے آنے والے اسرائیلیوں کا اور دوسری قسم کے یہودیوں کا جو یورپین نہیں تھے۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر ملک پر سفید لوگوں نے قبضہ کرلیا ہے، اور وہ پاھم کی طرح دوڑ رہے ہیں

دوڑرہے ہیں، کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ زمین اپنے قبضے میں کرلیں، خواہ اُس کے لیے اُنھیں نیگروز، ریڈ انڈینز اور نجانے کتنے دوسرے قسم کے اندھیرے لوگوں کا خاتمہ کرنا پڑے۔

جب ڈربن پہنچ کر کار رکی اور میں جاگا تو پپا کا دوست صبح کے ہلکے اندھیرے میں اُن سے اور ممی سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

اُس نے چلتے وقت کہا:

"So Henk not coming back to this gorgeously beautiful Suffocating country!"

("واپس نہیں آ رہے ہو ہینک، اِس خوبصورت ملک میں جہاں سانس گلے میں اٹکتی ہے"!)

پپا نے کہا "نو تھینکس۔ تم اپنی حفاظت کرو"۔

کچھ عرصہ بعد مجھے پتہ چلا پپا کا وہ دوست جیل میں ہے۔

رات کے کھانے کے بعد فیونا کو اوپر بھیجدیا گیا اور پپا اور ممی نے ٹینا سے آسکا آج کا چھوٹا سا ایڈونچر سنا جس میں وہ میری لیڈر رہی تھی۔ اُسوقت تک میرا غصہ یا رونا جو کچھ بھی تھا تھم چکا تھا اور میں اپنے آپ میں تھا۔

"سو واٹ اِز اِٹ سن؟" ممی نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا "کیا؟"۔

"یہی کہ آج کے واقعہ کا ڈالسٹائی سے کیا تعلق ہے؟"۔

"میں نے رک رک کر اُس رات کے سفر میں سنی ہوئی باتیں دہرائیں جو پپا اور اُن کے دوست کر رہے تھے

اور ممی اور پپا مجھے حیرت سے دیکھتے رہے۔ میرا خیال ہے وہ میری یادداشت پر خوش تھے۔

پھر میں نے ایک دم وہ سوال کیا جو آج دوپہر سے اُن سے کرنا چاہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے ٹالسٹائی نے اچھی کہانیاں لکھی ہونگی، لیکن میرا خیال ہے ٹینا جھوٹ بولتی ہے کہ اُس نے کہا تھا '٦ فٹ، سر سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک حقیقت میں ایک انسان کو زمین چاہیئے ہوتی ہے،

میرا سوال یہ ہے: ایک سفید آدمی کو کتنی زمین چاہیئے ہوتی ہے؟"۔

———

بوندا باندی

دولان پواسا یعنی رمضان کا مہینہ تھا اور چی کماریہ بنتی محمد یوسف روزے سے تھی۔

وہ خاموشی سے کھڑی بچوں اور میڈم کے کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔ اس کے پیچھے، اندر، غسل خانے کے ٹائل لگے ہوئے کپڑے دھونے کے حوض میں میناچی ہندو تامل لڑکی کپڑوں کو سرف کے جھاگ میں پھینچ رہی تھی۔ وہ بھی خاموش تھی۔ بچے، میڈم اور ماسٹر بالترتیب اسکول، بازار اور کام پر گئے ہوئے تھے صرف چھوٹی بچی باہر باغیچے میں کھیل رہی تھی اور اس طرح پورا گھر خاموشی کی لپیٹ میں تھا۔

میناچی جب غسل خانے سے دھوئے ہوئے کپڑوں کو لئے باہر نکلی تو اس کے سیاہ خوبصورت چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں جنہیں اس نے کندھا اچکا کر پونچھنا چاہا۔ وہ کماریہ کے پاس رک گئی حالانکہ دونوں میں بات چیت پچھلے دو دن سے بند تھی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے کماریہ سے پوچھا "لوکیٹ کا کچھ پتہ چلا؟"

کماریہ کا ہاتھ، جو میناچی کے پاس آکھڑے ہونے پر

زیادہ تیزی سے چلنے لگا تھا ایکدم سست پڑگیا۔ اس نے بھی کندھا اچکاکر اپنے گندمی چہرے پر سے پسینہ پونچھنا چاھا۔

ھوا میں امس تھا اور آسمان پر بادل جیسے ایک جگہہ جم کر رہ گئے تھے۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے پر پتہ چلتا تھا کہ کٹھل اور کیلے کے پتوں میں جنبش تک نہیں ہے۔

بالآخر کماریہ نے سر اٹھاکر میناچی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا

"نہیں۔ لیکن مینے بوموہ سے مدد مانگی ھے"

میناچی کی نظریں نیچے جھکنا چاہ رہی تھیں لیکن اس نے جی کڑا کرکے پوچھا

"پھر؟ اس نے کیا کہا ھے؟"

صابن کا جھاگ ابھی تک اسکی کہنیوں پر لگا ھوا تھا اور دھوئے ھوئے کپڑوں سے پانی فرش پر ٹپک رہا تھا۔

کماریہ نے گہری سوچ سے کہا "اس نے کہا ہے ٹھیک ہے میں سحر سے پتہ چلا لونگاکہ چور کون ہے اور اسے سحر ھی سے سزا بھی دونگا"

میناچی کا چہرہ فق ھوگیا اور وہ کپڑے دھوپ میں الگنی پر ٹانگنے کیلئے باہر چلی گئی۔

کماریہ نے اسے سنانے والے لہجے میں کہا

"میں نے اپنے باپ کو بھی خط لکھا ہے وہ کیڈاہ میں گھر پر بچاآن بنسین کرائے گا اور سورۃ یٰسین کے ختم ھونے تک چور کی حالت بگڑنے لگے گی۔"

میناچی کی عمر کم تھی۔ وہ بمشکل چودہ یا پندرہ سال کی تھی۔ اشتیاق کو دبانے کا فن جو عمر سے آتا ہے ابھی

اس میں پیدا نہیں ہوا تھا۔

وہ کماریہ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور پوچھنے لگی "سورۃ یٰسین کیا ہوتی ہے اور بچا ٓن کیسے منعقد کیا جاتا ہے؟"

کماریہ نے کہا "میرے باپ کے پاس علمو ہے۔ وہ قرآن کی چھتیسویں سورۃ پڑھے گا۔ ہمارے کیمپونگ (گاؤں) کی مسجد کا امام اور اڑتیس دوسرے آدمی، سب ملاکر چالیس آدمی، چھتیسویں سورۃ پڑھینگے ـــ اور دھوبی! اُن کے بچا ٓن کرنے سے چوری کرنے والا بچ کر نہیں جاسکتا"۔

کماریہ کے آخری جملے میں تلخی اور غیریت تھی۔ اس سے پہلے اس نے تامل ہندو لڑکی کو کبھی دھوبی نہیں کہا تھا۔ وہ اسے 'اڈے' (Adek) یعنی چھوٹی بہن کہتی تھی۔

میناچی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کا گلا رندھ گیا۔

کماریہ نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا "بچا ٓن یٰسین کا اثر کبھی خالی نہیں جاتا دھوبی! خواہ گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ لیکن اس معمولی سی چوری کیلئے تو یہاں کے بوموہ نے کہا ہے وہ خود ہی جادو سے چور کا پتہ چلالے گا"۔

میناچی نے باہر نکل کر اپنی سائیکل اٹھائی اپنی ساری کو کس کر باندھا اور سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا

"چی کماریہ کام ہو گیا ہے، میں جارہی ہوں"۔

اس سے پہلے اس نے بھی کماریہ کو چی کماریہ یعنی مس کماریہ نہیں کہا تھا۔ وہ اسے کاکا (Kakak) کہتی تھی۔

کماریہ خاموشی سے استری کرتی رہی۔

بولان پواسا ختم ہو رہا تھا۔ اس نے میڈم سے ھری رایا پواسا یعنی عیدالفطر پر اپنے گاؤں جانے کی اجازت پہلے سے لے لی تھی اور آخری ۲، ۳ روزے گھر پہنچ کر سب کے ساتھ رکھنے کا ارادہ تھا۔ یہاں لاکھ گھر والے اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے لیکن سحور اور بکاپواسا کا لطف جو اپنے کیمپونگ میں تھا وہ یہاں کہاں تھا۔ یہاں روزہ صرف عبادت تھی — وہاں اپنوں میں اس کے دونوں سرے، سحور کیلئے اندھیرے میں جاگنا اور بکا پواسا کے وقت بچوں کا میٹھی چیزوں پر ریلا عبادت سے بھی بڑھ کر کوئی چیز بنجاتے تھے۔ اس کے بعد عید کی خوشی تھی۔ نئے کپڑے، میک اپ کا سامان جو وہ اپنے ساتھ یہاں سے لے کر جاتی اور جنھیں دیکھ کر کیمپونگ کی لڑکیوں کے دلوں میں بھی کسی بڑے شہر میں جاکر کام کرنے کی خواہش کا جذبہ سر ابھارتا — اپنی چھوٹی سی دھان کے کھیتوں اور ناریل کے درختوں سے گھری ہوئی دنیا چھوڑ کر ایک ایسی دنیا میں قدم رکھنے کا خیال جس کے کنارے ہی نہیں تھے اور جہاں کماریہ بنتی محمد یوسف کئی بار خالی ہاتھوں گئی تھی اور ہر مرتبہ لدی پھندی واپس آئی تھی۔

لیکن اس خیال کے آتے ہی کماریہ کے دل کو جھٹکا سا لگتا تھا جیسے لمحے بھر کو وہ اس کا ساتھ چھوڑ گیا ہو۔

وہ لاکٹ کہاں تھا اور اس کی وہ زنجیر۔ دونوں سونے کے تھے اور اس نے ہزار قربانیوں کے بعد حاصل کئے تھے — ان کے بغیر چند دن پہلے وہ کیڈاہ جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی — لیکن اب جیسے وہی سونے کی زنجیر

اس کے گلے سے اتر کر اس کے پیروں میں لپٹ گئی تھی جو اسے گھر جانے سے روک رہی تھی۔

چار دن پہلے کی بات تھی جب اس نے لاکٹ اور زنجیر کو آخری بار دیکھا تھا اور نہانے کے بعد اپنے کمرے میں انھیں پہنکر خود اپنی شکل گردن اور سینے کا جائزہ آئینے میں لیا تھا۔ لاکٹ اچھا خاصا وزنی اور کامدار تھا۔ زنجیر سبک تھی اور اسکی وجہہ سے گردن اور سینے کے اوپر کا حصہّ جگمگا اٹھا تھا۔

اس کے بعد جہاں تک کماریہ کو یاد پڑتا تھا اس نے ہار کو دوبارہ میز کی دراز میں سر ڈھانکنے کے رومالوں کے نیچے چھپاکر رکھہ دیا تھا اور رومالوں کی تہہ کے اوپر بے ترتیبی سے میک آپ کا سامان، مصنوعی انگوٹھیاں اور بالوں کے کلپس وغیرہ بکھیر دئیے تھے۔

لیکن اگلی دوپہر جب وہ چھوٹی بچی کو نہلانے کے بعد دودھ پلا کر سلا چکی تھی، میڈم اوپر سو رہی تھیں اور گھر میں ہرطرف خاموشی تھی—— تو اس کے دل میں ایک بار پھر ہار کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھہ بچی کے سر کے نیچے سے نکالا، بغیر کسی قسم کی آواز پیدا کئے پلنگ سے اٹھی اور پنجوں کے بل چلتی ہوئی اپنی میز تک گئی۔ اس کے بعد اس نے دراز بھی ایسے کھولی جیسے وہ چوری کر رہی ہو۔

لیکن دوہی منٹ بعد وہ یہ تمام احتیاط بھول گئی اور گھبراہٹ میں دراز کی چیزیں کھکھوڑنے لگی۔ ایک ایک چیز کو اس نے بار بار دیکھا۔

بتی جلانے پر بچی اٹھہ کر بیٹھہ گئی۔

کماریہ رومالوں کی تہوں کو کھول کھول کر دیکھہ

Scanned by CamScanner

رہی تھی۔ اس لیے اپنی گردن اور سینے کو ٹٹولا اور جب بچی نے اس سے پوچھا

"کیا ہے کماریہ؟"

تو اس نے بچی کو دونوں بازؤں سے پکڑتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں اپنی انگریزی میں کہا

"بے۔بی۔ یو سی مائی لوکیٹ؟" (تم نے میرا لاکیٹ دیکھا ہے؟)

بچی نے نہیں کرنے والے انداز میں اپنا سر ہلایا اور وہ بھی تلاش میں شامل ہو گئی۔

لیکن شام تک وہ نراش ہو چکی تھی اور عید پر گھر جانے کی خواہش جیسے اس کے اندر آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اپنی سب سے قیمتی چیز، بچت اور کفایت شعاری کے اس سب سے بڑے ثبوت کے بنا گھر جانا اسے بے مصرف نظر آرہا تھا۔ کیمپونگ میں اب تک سب کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ چی کماریہ نہ صرف دوبارہ آسودہ حال ہو چکی ہے بلکہ اپنی شادی کا سامان بھی اکھٹا کر رہی ہے۔ خالی، سونا گلا لیکر وہ بس سے اپنے گاؤں میں اترنے کی سبکی کو بھی محسوس کر رہی تھی اور اپنی متاع کے لٹ جانے کا غم بھی اسے کھائے جارہا تھا۔

بالآخر جب میڈم کو یہ خبر معلوم ہوئی تو گھر میں بھونچال سا آگیا۔

مکان کے اس حصّے میں جہاں کماریہ رہتی تھی کون کون جاتا تھا؟— ایک تامل دودھ والا جو باہر سے باہر ہی دودھ کی بوتل دے کر چلا جاتا تھا۔ ڈبل روٹی والا؟ وہ بھی اندر نہیں آتا تھا اور لین دین باورچی خانے کی کھڑکی ہی کے ذریعے ہوتا تھا۔ سامنے کے گھر والوں کی آما؟ لیکن

وہ بہت دن سے اس طرف نہیں آئی تھی اور اگر آتی بھی تو کماریہ کی طرح وہ بھی میلے مسلمان تھی اور میلے مسلمان چوری نہیں کرتے ہیں۔

لے دے کر ایک ہستی رہ جاتی تھی۔

"میناچی"!

میڈم نے سوچ بھرے لہجے میں اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا لیکن کماریہ کو جیسے پہلے ہی سے میناچی پر شبہہ تھا اب ایکدم اپنے شبہہ کی تصدیق ہوتی نظر آئی۔ میناچی کا سیلونیز تامل ہونا، اور وہ بھی دوسرے مذہب کا، اس کے نزدیک ایک طرح سے نصف جرم پہلے ہی سے تھا۔

اس چوری نے میناچی کو قعر مذلت میں ڈھکیل دیا۔

اگلی صبح اس نے میناچی کو ٹھیک وقت پر دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا اور خاموش اپنی جگہہ پر بیٹھی رہی۔

میناچی نے اپنے بائیسکل باورچی خانے کے باہر دیوار کے سائے میں کھڑی کردی اور پسینہ پونچھتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

کماریہ کا خیال تھا آج میناچی نہیں آئیگی کیونکہ اسے پکڑے جانے کا اندیشہ ہوگا۔ لیکن میناچی کی اس ڈھٹائی پر اس کے عادی مجرم ہونے کا اسے یقین ہوگیا۔

دونوں میں ایک آدھ بات اِدھر اُدھر کی ہوئی اور پھر میناچی میلے کپڑے لیکر غسلخانے میں چلی گئی

کچھہ دیر بعد وہاں کماریہ بھی آگئی اور بے ضرورت اِدھر اُدھر چیزیں کھکھوڑنے لگی۔

میناچی نے پوچھا "کیا دیکھہ رہی ہو؟"

کمارید نے اس کے چہرے پر نظریں جماکر کہا
"کچھ کھوگیا ہے"

لیکن میناچی کے نہ ہاتھ رکے نہ ہی چہرے پر کوئی رنگ آیا اور گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے پوچھا "ملا؟"

"نہیں" کمارید نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ پھر خود ہی بولی
"میرا لاکٹ اور سونے کی زنجیر کل سے غائب ہیں، میڈم کو بھی معلوم ہے"

آخری جملہ ایک طرح کی دھمکی تھی۔

غسلخانے میں میناچی کے ہاتھ اسی طرح چلتے رہے۔

ایک بار پھر تھوڑے توقف سے کمارید اندر آئی اور میناچی کے چہرے پر نظریں گڑھو کر بولی
"لیکن ابھی تک ماسٹر کو معلوم نہیں ہوا ہے"

یہ دوسری بڑی دھمکی تھی۔

کام ختم کرکے میناچی خاموشی سے باہر نکلی اور بغیر کمارید کی طرف دیکھے اپنی بائیسکل اٹھاکر مکان کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

اس کی خفگی کمارید کی سمجھ سے باہر تھی اور "ابھی تک ماسٹر کو معلوم نہیں ہوا ہے" والی دھمکی کا بے اثر جانا ہار کو ہمیشہ کیلئے کھو بیٹھنے کے مترادف تھا۔

کمارید اور میناچی کے اس دوبدو کے بعد گھر والوں کی نظر میں میناچی ایک ایسی ہستی بن گئی جس کے گھر میں موجود رہنے کے وقت کسی نہ کسی کا اس پر نظریں رکھنا لازم ہوگیا۔

Scanned by CamScanner

وہ جب تک گھر کے اندر رہتی کوئی نہ کوئی ادھر آدھر اس کے پاس بھٹکتا رہتا، میڈم خود، کوئی لڑکا یا لڑکی، کمارید یا چھوٹی بچّی۔ جب وہ احاطے سے باہر نکل جاتی تو باہر الگنی پر پھیلے ہوئے کپڑوں کی گنتی ہوتی اور بچے کیلے، کٹھل اور چمپا کے پیڑوں کا جائزہ لیتے کہ چلتے چلتے کچھ لے تو نہیں گئی ہے۔

اسی اثناء میں میڈم کو یاد آیا چھ ماہ پہلے انکا ایک بلاؤز غائب ہوگیا تھا جو لانڈری سے نہیں گھر پر ہی سے غائب ہوا تھا، غالباً ان کے بیڈروم سے ـــ جہاں میناچی کا گذر بھی نہیں تھا ـــ اورکئی مرتبہ درختوں پر سے پھل بھی غائب پائے گئے تھے اور گیراج میں پڑے ہوئے ناریل بھی گاہے بگاہے کم ہو جاتے تھے اور کوئی انکی طرف دھیان نہیں دیتا تھا۔

کمارید کے لاکٹ کی چوری وہ اسپوٹ لائیٹ تھی جس نے میناچی کے کردار کو زندگی کی اسٹیج پر باقی سب کرداروں سے ممیّز کردیا تھا، اور اس روشنی میں وہ بجائے خجل نظر آنے کے زیادہ کھلنڈڑی نظر آرہی تھی۔

دو دن کی خاموشی کے بعد آج میناچی نے کمارید سے سے اس لاکٹ کے بارے میں پوچھا تھا اور بوموہ اور بچاّن یٰسین کا ذکر سن کر خاموشی سے اس نے اپنی ساری کس کر اپنی ٹانگوں کے گرد لپیٹی تھی اور بائیسکل پر بیٹھ کر احاطے سے باہر نکل گئی تھی۔

دن بھر کمارید وقفے وقفے سے اپنے کمرے میں پڑی روتی رہی۔ اسے ہار کے جانے کا قلق بھی تھا اور روزے میں جھوٹ بولنے کا افسوس بھی ـ بوموہ سے مدد طلب کرنا اور باپ کو بچاّن یٰسین منعقد کرانے کیلئے لکھنا دونوں باتیں

غلط تھیں اور محض دھمکی کے طور پر وہ الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔

اس کے علاوہ ایک تیسرا گناہ بھی اس کے روزے کے ثواب کو کم کر رہا تھا ــــ کسی پر جھوٹا شبہہ کرنا، بہتان!

بکا پواسا کے وقت اس نے منھ کے نزدیک کھجور لیجاتے ہوئے ہار کے ملنے کی دعا مانگی کیونکہ اس وقت کی دعا بچاآن پنسین کی طرح کبھی بے تاثیر نہیں ہوتی اور بعد میں دل ہی دل میں خود کو معاف کرنا چاہا کہ میںنے کھلے الفاظ میں میناچی سے یہ نہیں کہا تھا کہ چوری تم نے کی ہے، اس لئے میرے الفاظ بہتان نہیں گردانے جاسکتے۔

افطار کے بعد بارش شروع ہوگئی اور پانی رات بھر برستا رہا۔

صبح جب وہ اٹھی تو آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے انکے نیچے اتر آنے سے اندازہ ہوتا تھا بوندا باندی کا سلسلہ دن بھر جاری رہے گا۔

خلاف توقع میناچی آج وقت سے پہلے ہی کپڑے دھونے کیلئے آگئی اور اس کے چہرے پر سے وہ کھنچاؤ بھی غائب ہو چکا تھا جس کا شکار وہ پچھلے چند دنوں سے نظر آرہی تھی۔

کھڑکی کے باہر بائیسکل کھڑی کر کے وہ تیز تیز چلتی ہوئی اندر آئی اور پھولی ہوئی سانس سے بولی
”رات تمہیں نیند تو نہیں آئی ہوگی کاکا؟!“
کماریہ نے پرسکون لہجے میں کہا ”نہیں اڈے، میں

خوب اطمینان سے سوئی۔ جو چیز جانی تھی سو چلی گئی اب اس کیلئے غم کیوں کروں"۔

میناچی اس کے پاس اسٹول پر بیٹھ گئی جیسے اپنی سانس درست کر رہی ہو۔ پھر قدرے توقف سے بولی

"میں ہار اور لاکٹ ڈھونڈھنے میں تمہاری مدد کروں؟"

کماریہ خاموش رہی۔ پچھلے چار دن سے وہ جس ذہنی کش مکش میں مبتلا رہی تھی، عید پر گھر بغیر ہار کے جانے کا تصور، محنت کی کمائی کا لٹ جانا، کسی پر بہتان لگانے کا گناہ ــــ اس تمام انتشار کو جیسے افطار کے وقت کی دعا نے ختم کردیا تھا۔

میناچی اتاؤلی سے بولی

"کل شام میں مندر گئی تھی اور رات جو خواب میںنے دیکھا اس میں میرے پرکھوں کی آتماؤں نے مجھ سے بات کی۔ مجھے انکی شکلیں نظر نہیں آرہی تھیں لیکن آواز سے میں پہچان سکتی تھی انمیں سے کون، کون تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا 'بیٹی پریشان مت ہو۔ لاکٹ اور ہار تو اسی گھر میں موجود ہیں، آما کے کمرے میں۔ جاؤ اور انہیں ڈھونڈھنے میں اس کی سہایتا کرو'۔"

کماریہ کے چہرے پر، جو اب تک اکتاہٹ کا غماز تھا، ایک بار پھر جاگتی ہوئی آس ابھر آئی۔

"میں ڈھونڈواؤں تمہارے ساتھ مل کر کا کا؟"

میناچی نے کہا۔

اور بغیر کماریہ کا انتظار کئیے وہ اس کے کمرے میں جانے لگی۔

اس کے پیچھے پیچھے کماریہ بھی چلی آئی اور تھوڑی

ھی دیر بعد چھوٹی بچی بھی اس کھیل میں ان دونوں کی شریک ھو گئی۔

کاٹھ، کباڑ میں، میز کی درازوں میں، ایک ایک کپڑے کو جھاڑ کر،

ایک بار چھوٹی بچی نے کہا "وہ رہا"

کماریہ اس کی طرف پلٹی

"وھئیر بے ـ بی ـ؟"

بچی نے چھت کے پاس لگے ہوئے روشندان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"دیئر" ـــــ "مائی ڈول!" (وھاں ـ دکھائی دی میری گڑیا!)

دونوں ھنس پڑیں کیونکہ بچی نے واقعی اپنی کھوئی ہوئی گڑیا وھاں پھنسی ہوئی دیکھ لی تھی۔

لیکن اس اثناء میں میناچی کماریہ کے بستر کو الٹ پلٹ کرنے لگی

"ٹھیک آما کے کمرے کے اندر ـ آوازوں نے کہا تھا" وہ بولی۔

کماریہ کو اس کی اس آوازوں پر جیسے اعتقاد ھوتا جارہا تھا ـ جیسے افطار کے وقت کی دعا کا جواب مندر سے آنے کے بعد میناچی کے خواب کی آوازوں نے دیا تھا۔

تب ہی کھٹاک سے کوئی چیز میٹرس کے نیچے سے فرش پر گری اور چھوٹی بچی جب اسے پلنگ کے نیچے گھس کر باہر لائی تو وہی مکمل ھار اس کے ھاتھ میں جگمگا رہا تھا جس کے پیچھے کماریہ پچھلے چار پانچ دن سے نہ ٹھیک سے سو سکی تھی نہ عبادت کر سکی تھی۔

چھت پر بوندیں گر رھی تھیں۔

Scanned by CamScanner

کماریہ خاموشی سے روتی رہی۔
میناچی باہر جاتی ہوئی بولی "آج کپڑے سوکھ نہیں سکینگے۔ کل تک ان میں بدبو آجائیگی، میڈم سے کہنا میں کل آؤنگی"۔
"آل رائیٹ اڈے، آئی گو ٹیل میڈم" کماریہ نے شک اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

اس واقعے کے تیسرے دن کماریہ بنتی محمد یوسف اپنے کیمپونگ چلی گئی جو کیڈاہ میں بالینگ کے نزدیک تقریباً ۳۵۰ میل دور تھا اور جس کے چاروں طرف دھان کے کھیت تھے اور ناریل کے درخت۔

میناچی کو اب گھر میں بمشکل برداشت کیا جارہا تھا۔ خواب کا واقعہ سب کو ڈھونگ نظر آتا تھا اور ہار کی تلاش ایک ڈرامہ جسے میناچی نے خود تصنیف کیا تھا۔
ممکن ہے وہ خود اس صبح جب سب سو رہے تھے گھر میں کسی طرف سے داخل ہوئی ہو اور ہار کماریہ کے میٹریس کے نیچے چھپاکر رکھ گئی ہو اور یہ بھی ممکن تھا ہار اس کے ہاتھ میں تھا جسے اس نے کسی مشاق بازی گر کی طرح ٹھیک موقع پر میٹریس کے نیچے ہاتھ ڈال کر فرش پر گرادیا تھا۔
جانے سے پہلے کماریہ کی بھی یہی رائے تھی کیونکہ وہ خود کئی بار بستر کو الٹ پلٹ کر دیکھ چکی تھی اور وہاں ہار کے چھپے رہجانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
بہرحال میناچی کی موجودگی اس گھر میں اب ایسے

حصہ جسم کی تھی جسنے کاٹا بھی نہ جاسکتا ہو اور جو کسی خاص مصرف کا بھی نہ ہو، کیونکہ دھلنے کے کپڑے گن کر دئیے جاتے تھے اور اس کے جانے کے بعد بھی گنے جاتے تھے اور کسی نہ کسی کو جتنی دیر وہ گھر میں رھتی تھی اس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔

عید کے دس دن بعد جب کماریہ اپنے گاؤں سے واپس لوٹی تو دن خاتمے کو پہنچ رہا تھا۔ بس کے لمبے سفر سے وہ تھکی ہوئی تھی۔ سب اس کے چاروں طرف جمع ہوگئے اور چھوٹی بچی اس کی گود میں جاکر بیٹھ گئی۔

"بے۔بی۔ نو ٹیک مچ سٗو سٗو ڈیلی میڈم؟" (بچی روزانہ ٹھیک سے دودھ نہیں پیتی رہی ہے؟)۔ اس نے بچی کے گالوں پر ھاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"پلینٹی کماریہ" میڈم نے پیار سے کہا (بہت کافی۔ کماریہ)

کماریہ نے میڈم کے جواب کو آن سنا کرتے ہوئے بچی سے کہا

"نو مانڈی ٹوڈے بے۔بی۔؟" (آج نہائی نہیں بے۔بی۔؟)

بچی نے کماریہ سے لپٹتے ہوئے کہا

"آئی ڈو مانڈی ورد یٗو ناؤکماریہ" (اب میں تمہارے ساتھ نہاؤنگی کماریہ)

بچی کی گھر والوں سے اس طوطا چشمی پر سب ھنس پڑے۔ واقعی میں وہ اتنے دن بغیر آما کے بجھی بجھی سی رھی تھی۔

کماریہ نے بیگ سے سب کو نکال نکال کر سوغاتیں تقسیم کرنی شروع کیں۔ پھل جو سب کملائے تھے مانگیس،

رمبوتان، بڑی بچی کیلئے سیپیوں کا ہار اور دونوں بچیوں کیلئے چٹائی کے جوتے۔ لڑکے کیلئے چٹائی کا ہیٹ اور میڈم اور ماسٹر کیلئے دوسرے تحائف۔

پھر اس نے ایک پیکٹ دوبارہ بیگ میں واپس رکھتے ہوئے میڈم سے پوچھا

"میناچی کم میڈم؟" (میناچی آنی رہی ہے؟)

"یس" ۔ میڈم نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میں اسے چھٹی دینے والی ہوں۔ اب تم آگئی ہو تو کوئی نئی دھوبی لڑکی ڈھونڈھنا"۔

"وائی میڈم؟" کماریہ نے حیرت سے پوچھا (کیوں)

"میں تو اس کیلئے تحفہ لائی ہوں"۔

"بیکوز شی از تھیف" (کیونکہ وہ چور ہے)

"نوٹ اے گڈ گرل"

"نو میڈم۔ میناچی نو تھیف۔شی از گڈ گرل" کماریہ کا چہرہ پرسکون تھا

(میناچی چور نہیں ہے۔ اچھی لڑکی ہے)

"پھر چور کون ہے؟" میڈم نے کہا

کماریہ خاموش رہی۔

"لاکیٹ کس نے چرایا تھا؟" میڈم نے تلخی سے کہا

"میناچی نے" کماریہ نے بے دلی سے جواب دیا۔

"اور پھر بھی تم کہتی ہو وہ چور نہیں ہے۔ اچھی لڑکی ہے!" میڈم نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا

"یو آر اے اسٹرینج گرل یورسیلف کماریہ" (تم خود عجیب لڑکی ہو)

کماریہ کچھ دیر خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی

"اس نے چوری کی تھی لیکن اس ایک بات سے وہ بری لڑکی کیسے ہوگئی! اس کے تو دل میں خوف ہے"۔

میں نے نہ بوموہ سے کہا تھا نہ ہی اپنے باپ کو خط لکھا تھا اور بچا ن ڈیسمن تو ویسے بھی صرف اس وقت کام کرتا ہے جب چوری کرنے والا مسلمان ہو اور جانتا ہو چھتیسویں سورۃ کا ورد کیا جارہا ہے۔ میناچی تو ہندو ہے وہ اس پر کیا اثر کرتا"۔ وہ کھلکھلاکر ہنس پڑی۔

"میں نے جب یہ بات اپنے بھائی کو بتائی تو وہ ہنسنے لگا۔ میں نے کہا 'اگر میناچی مسلمان ہوتی اور میلے تو میں تمہاری شادی اس سے کرادیتی'۔ وہ کہنے لگا 'اگر وہ مسلمان ہوتی اور میلے تو تمہارا شک اس پر گیا ہی نہ ہوتا'۔"

میڈم نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا

"لیکن وہ چور ہے۔ ہمارا تو خیال تھا تمہیں اس سے نفرت ہوچکی ہوگی"

کماریہ سوچ میں پڑگئی۔

واقعی اسے میناچی سے نفرت کیوں نہیں ہوئی تھی؟ یا یہ کہ ہوئی تو تھی لیکن، کیوں نہیں رہی تھی؟

چھوٹی بچی اس کی گود میں بیٹھی اس کی قمیص کے بٹنوں کو کھولنے بند کرنے کا کھیل کھیل رہی تھی۔ میڈم کا لڑکا اور بڑی لڑکی جیسے کماریہ کا جواب سننے کے انتظار میں کھڑے تھے۔

باہر سے تازہ ہوا کا ایک جھونکا جلد شروع ہونے والی بارش کی خبر لیکر کھڑکیوں کے پردے اڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔

لیکن جب کماریہ نے میڈم کے سوال کا جواب دینا

Scanned by CamScanner

شروع کیا تو اس کا دماغ خود کہیں اور تھا۔ منہ سے وہ کہہ رہی تھی

"ٹھیک ہے میڈم۔ آدمی ہی چور بھی ہوتے ہیں اور میرے خیال میں میناچی بھی آدمی ہی ہے۔ اس کا چور ہونا اتنی عجیب بات نہیں ہے، عجیب بات تو یہ ہے کہ وہ بوموہ ہی کی دھمکی سے ڈر گئی۔ اور میں نے تو وہ لوگ بھی دیکھے ہیں جو پیمباچ، قرآن ہوتے ہیں اور خدا کی دھمکی تک ان پر اثر نہیں کرتی ہے"۔

لیکن جو سوال اس کے دماغ میں گونج رہا تھا اس کا جواب ان الفاظ کے ساتھ ساتھ، چڑھے ہوئے پانی کے اترنے پر دھیرے دھیرے نمودار ہونے والے بھومی کے پہلے ٹکڑے کی طرح، ایک عجیب سچائی کی طرح وہاں ابھر آیا، جس سے اسے تعجب ہوا آج تک وہ ناواقف تھی —

نفرت بھی تو محبت ہی کی طرح ہوتی ہے: ہوتی ہے اور پھر نہیں رہتی۔

"کماریہ، کھڑکیاں بند کرو" کی آواز پر وہ چونکی۔

"میڈم اور بچے کھڑکیاں اور دروازے بند کر رہے تھے اور اس نے میڈم کو کہتے ہوئے سنا

"کماریہ، تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں"۔

اگلے دن جب میناچی آئی اور میڈم نے کماریہ سے سرگوشی میں کہا

"اس پر نظر رکھنا کماریہ۔ اور کپڑے گن کر دھلنے کو دینا"

تو کماریہ نے عجیب نظروں سے، جیسے وہ ان کی بے عقلی پر متاسف ہو، میڈم کو دیکھتے ہوئے کہا

"وائی میڈم؟! دیٹ گو بریک ھر ھارٹ"
(لیکن کیوں میڈم؟! اس سے تو اس کا دل ٹوٹ جائیگا)

اسے ایک بار پھر تعجب ھوا اس جملے کے ساتھ ساتھ جو خیال دماغ نے اندر ہی اندر ادا کیا تھا وہ قطعاً مختلف تھا:

'میڈم یو نو فائنڈ ایور نو نیو تھوٹ اِن یو؟'
(میڈم آپ کو اپنے اندر کبھی کوئی نیا خیال نہیں ملتا؟)
پھر اس نے رُکا ھوا سانس چھوڑتے ھوئے سوچا
'شاید میڈم اور میں مختلف مٹی سے بنے ہیں'

———

رہائی

زندگی میں کوئی چیز اگر نفرت کئے جانے کے لائق ہے تو وہ نفرت ہے۔

مجھے صرف نفرت سے نفرت رہی ہے۔ میں کچھ لوگوں سے نفرت کیوں نہیں کرسکتی تھی اس پر میرے ماتا پتا اکثر ناراض ہوجایا کرتے تھے اور میں کچھ لوگوں سے نفرت کیوں نہیں کرتی ہوں بعد میں اسی بات پر میرے سسرال والے مجھ سے نفرت کرنے لگے۔

ہم گنگا اشنان سے لوٹ رہے تھے۔ وہاں ہم کیوں گئے تھے یہ ہمارے گھر والے جانتے تھے اور وہاں جانے سے ہمارا مقصد حل نہیں ہو سکتا تھا یہ ہم دونوں اچھی طرح جانتے تھے۔ ویسے سسرال والے صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ میں نِشپھل ہوں اور شاید گنگا جل کے چھینٹوں سے مجھ پر بھی بور آجائے۔ میرا خیال ہے میرے پتی کچھ زیادہ ہی دھرم ایمان والے رہے ہونگے ورنہ گنگا یاترا پر اوروں کے کہنے پر پیسے پھونکنے کو نہ چل پڑتے۔ شاید وہ معجزوں کے قائل تھے۔

ویسے خود مجھے گنگا سے عقیدت آج بھی ہے۔ ہر دریا سے ہے۔ اس میں میرے خون کو دخل نہیں ہے، البتہ میرے بچپن کو ہے۔

پورب سے پچھم اور پچھم سے پورب آتے جاتے ہم ٹرین میں بارہا گنگا پر سے گذرے تھے۔ ہر مرتبہ سمے آنے سے پہلے ہی میری ماں مٹھی بھر دونیاں، چونیاں ہاتھ میں سنبھال کر بیٹھ جاتی تھیں اور ہم سب کے ہاتھوں میں بھی تھوڑی تھوڑی ریزگاری ہوتی تھی۔ بیچ کی سیٹوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں بھی گنگاجی پر نظر آتے ہی ہماری کھڑکیوں کے پاس والی سیٹوں پر آجاتی تھیں۔ اس معاملے میں میری ماں سے کبھی بھول چوک نہیں ہوئی وہ ہمیشہ کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر بیٹھتی تھیں خواہ اس کیلئے انہیں ہم سب کو لیکر سوار ہونے والے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھلے آسمان کے نیچے آدھی رات ہی سے کیوں نہ بیٹھنا پڑے۔

مجھے اس سفر کا ہر حصہ اچھا لگتا تھا خاص طور سے جب ٹرین کسی پُل پر سے گذرتی تھی لیکن گنگا پرسے گذرنے کی بات ہی دوسری تھی۔ نارنگی رنگ کا لوہے کا ہر گرڈر تیزی سے اوپر کواٹھتا تھا پھر نیچے کو جاتا ہوا لگتا تھا اور ایسا کرنے میں اس میں سے آوازیں نکلتی تھیں۔ میں سوچتی تھی ہمارے شہر کے وہ بچے کتنے بدنصیب ہیں جنھوں نے اس طرح پُل کو اوپر نیچے ہوتے کبھی نہیں دیکھا۔

اسی گھڑگھڑاہٹ میں انجن کی سیٹی کی آواز دو ایک بار گونجتی تھی جیسے اس نے بھی ہمارے کمپارٹمنٹ کی تمام عورتوں کی طرح گنگا کو پرنام کیا ہو۔ تب ہی پیسے اور دونیاں، چونیاں لوہے کے گرڈروں سے ٹکراکر چھناکے کے ساتھ پانی میں گرتی تھیں۔ دوسرے ڈبوں سے بھی لوگ مٹھی بھر بھر کر پیسے پھینکتے تھے۔ میں کھڑکی سے

Scanned by CamScanner

سر نکال کر پیچھے کے ڈبوں کی طرف دیکھتی تھی کہ ان میں سے میرے پتا کا ھاتھ کونسا ہے؟

لیکن ایک بار جب ایک سکہ پُل سے ٹکراکر میرے سر سے آکر لگا تو مینے گھبراکر سر اندر کرلیا۔ اس کے بعد سے میں نے سر باہر نکالنا بند کردیا اور اگر دن کو ہم پل پر سے گذر رہے ہوتے تھے تو میں بس ان بیراک لڑکوں کو دیکھنے پر اکتفا کرتی تھی جو ان پیسوں کو لپکنے کیلئے پل کے آس پاس پانی میں آدھے چھپے آدھے کھڑے نظر آتے تھے۔

مجھے معلوم تھا میرا چھوٹا بھائی ایک آدھ چونی دو انگلیوں کے بیچ اس طرح پکڑے رکھتا تھا کہ وہ پانی میں گرنے سے رہ جاتی تھی۔ یہ ہم دونوں کا مشترک گناہ تھا جو ہم گنگا کے خلاف کر رہے تھے۔ میرا اس وجہ سے کہ باوجود چوری پکڑ لینے کے مینے یہ بات ماں سے نہیں کہی تھی۔ قاعدے سے مجھے اس کے اس فعل سے نفرت ہونی چاہئیے تھی لیکن نہیں ہو سکی۔ یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔

اکثر رات کو سفر میں جب میں سوئی ہوئی ہوتی تھی تو ماں مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا دیتی تھیں۔ تب دریا بالکل بدلا ہوا لگتا تھا۔ لوھے کے گرڈر اسی طرح تیزی سے سر اٹھاتے گراتے جاتے تھے ('کیا پل ھمیشہ اسی طرح کرتا رھتا ہے؟')۔ نیچے دریا بڑا شانت نظر آتا تھا۔ چاند کی روشنی سے کیسی کیسی لہر کی کگر چمک اٹھتی تھی، یا پورا ہی چاند دریا میں اترا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نیند سے بوجھل سر کھڑکی کی دھلیز پر ٹیک دیتی تھی۔

دور کبھی کبھی کنارے پر درختوں کے جھنڈ میں آگ جلتی نظر آتی تھی۔

Scanned by CamScanner

اور پیسے کھنکھناتے، لوہے کے گرڈروں سے ٹکرا کر پل کے نیچے کے اندھیرے میں ڈوب جاتے تھے۔

یہ سب سالوں پرانی باتیں تھیں۔ اس رات میں ڈبے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ رات کا سفر تھا، ہم گنگا دوارا سے واپس آرہے تھے — میں اور میرے پتی۔ پتی دیوتا آگے کے کسی ڈبے میں بیٹھے تھے۔ انہیں عورتوں کا مردوں کے ساتھ بیٹھنا ناپسند تھا ورنہ یوں مجھے اکیلے کمپارٹمنٹ میں نہ چھوڑتے۔

دریا میں نہانے کے بعد مجھے جسم میں ہلکی سی حرارت محسوس ہو رہی تھی اور رات کی ٹھنڈی ہوا گرم جسم سے ٹکراتی ہوئی مجھ پر نشے کا سا کام کر رہی تھی۔

ہمارے اسٹیشن کے آنے میں چار پانچ چھوٹے اسٹیشن بیچ میں پڑتے تھے اور شاید ابھی ڈیڑھ، دو گھنٹے کا سفر باقی تھا۔

مجھے گھر پہنچنے کی جلدی نہیں تھی۔ وہاں بچے میرا انتظار نہیں کر رہے تھے۔ صرف سسرال والے تھے جو مجھ سے زیادہ میری گنگا جلی کے منتظر تھے جو اس وقت میری سب سے بڑی دولت تھی۔ جن سے میرا الوبندھن تھا مجھے معلوم تھا گھر پہنچتے ہی مجھ سے غیریت برتنے لگینگے کیونکہ بیوی سے زیادہ قربت، وہ مجھے بارہا بتا چکے تھے، گیان دھیان میں حارج ہوتی ہے۔

اور حقیقت میں ان کی عمر گیان دھیان کی تھی بھی۔

میں زندگی سے نفرت نہیں کرتی تھی لیکن اس کم‌عمری میں بھی اس کی یکسانیت سے اکتا چکی تھی۔ گھر میں

Scanned by CamScanner

نہ کچھ کرنے کیلئے تھا جو میری پسند کا ہوتا، نہ ہی کچھ پڑھنے کیلئے تھا۔ سارے دن بھاگوت کون پڑھ سکتا ہے!

جب ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تو میں نے روشنی کے کھمبے سے ٹیک لگائے سیاہ یونیفارم پہنے ہوئے ٹکٹ چیکر کو اپنی طرف تکتے ہوئے دیکھا۔ کھمبے کے اوپر مٹی کے تیل کا پرانے فیشن کا لیمپ جل رہا تھا جس پر اسٹیشن کا نام تین زبانوں میں لکھا تھا۔

اس مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بمشکل نظر آرہا تھا۔ اس اسٹیشن پر جہاں دن میں بھی اکا دکا مسافر ہی چڑھتا اترتا تھا رات کو یہاں ٹرین محض وضع داری کی خاطر ٹھیری تھی۔

میرے پتی مجھ سے ملنے کیلئے بیتاب نہیں تھے کیونکہ ہماری شادی کو تین سال بیت چکے تھے اور ہر اسٹیشن پر بیوی پر ایک نظر ڈال آنے کے اتاؤلے پن کے دور سے وہ کب کے گذر چکے تھے۔ مینے ٹکٹ چیکر کو دیکھا، خوانچے والے کو اور خوانچے کے نیچے سوئے ہوئے کتے کو اور یہ معلوم ہوکر کہ میں اس وقت کہاں ہوں خود بخود میری آنکھیں پھر نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ میرے جسم میں ابھی تک دریا میں نہانے کی تمازت باقی تھی اور رات کی ہوا ٹھنڈی تھی۔

گارڈ کی وھسل، انجن کی سیٹی، بھاپ چھوڑنے کی دو چار آوازوں اور کمپارٹمنٹوں کے بیچ کی زنجیروں کے کراہنے تک تو میں ٹرین کی اس گھونگھے کی سی چال کے ساتھ تھی لیکن جب چونکی تو اسٹیشن بہت پیچھے

رہ گیا تھا، باہر اندھیرا تھا اور ٹرین خاصی رفتار پکڑ چکی تھی۔

میں نے ٹکٹ چیکر کو اندر سے دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کی پیٹھ، میری طرف تھی۔

میں اپنے کو ناستک تو نہیں سمجھتی تھی لیکن نجانے کیوں اس سمے بھی میں نے گنگا جلی کا سہارا لینا ضروری نہیں سمجھا۔

میرا خیال ہے وہ جھپکی سب سے لمبی نیند تھی جو آج تک میں نے لی ہے اور جس طرح نیند پوری ہوجانے پر رات کا انت ہوتا ہے اور نیا دن نکلتا ہے اسی طرح اس جھپکی کے ایک طرف میری جیون کتھا کی سندھیا ہے اور دوسری طرف پربھات۔

بجائے چوکنّی ہوکر بیٹھ جانے کے میں نے میچی ہوئی آنکھوں سے دبے قدموں اسے اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ تقریباً تیس پینتیس سال کا مضبوط جسم کا، گورا، اور شاید اسی وجہ سے اوروں کیلئے خوبصورت، پچھم کی طرف کا آدمی تھا۔

جب وہ میرے پاس پہنچ گیا تو میں نے ایک دم سر اٹھاکر پوچھا ”کیا ہے؟“— اور یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ میں خطرے کو، اگر کوئی تھا، تو خاطر میں نہیں لارہی ہوں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

جب تک ایک عورت مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ دیکھ لے مرد اپنی قوت کے استعمال سے ایساہی ناواقف ہوتا ہے جیسے کسی کو اپنا وارکرنے کا موقع نہ مل رہا ہو۔ میرے لاتعلقی سے باہر دیکھنے کی وجہ سے وہ اپنا حربہ بھول گیا اور بوکھلاہٹ میں بولا
”ٹکٹ“۔

مجھے معلوم تھا ٹکٹ میرے پتی کے پاس ہے پھر بھی ظاہری بے دھیانی سے میں پرس کھکھوڑنے لگی اور پھر میں نے پرکھنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"رہنے دیجئیے جی" اس نے میری نظروں میں نظریں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اور اوپر کی برتھ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر مجھ پر جھک کر اس طرح کھڑا ہوگیا کہ میرے لئے بھاگنے کا راستہ نہیں رہا۔

میرے دل میں پتی کیلئے غصّے کی ایک لہر دوڑ گئی جو مجھے اکیلے عورتوں کے کمپارٹمنٹ میں بٹھا کر اپنے دھرماتماپن کو لئیے مردوں کے ڈبے میں نشچنت بیٹھے ہونگے۔ انہیں مجھ سے اب کسی قسم کی توقع رکھنے کا کیا حق تھا!

لیکن عورتیں اپنے شوہر کی نفرت میں گھر نہیں لٹا دیتیں۔

گنگا جلی مجھ سے دور رکھی ہوئی تھی۔ میں نے بے بسی سے زنجیر کی طرف دیکھا، وہاں تک بغیر ہاتھا پائی کے پہنچنے کا امکان نہیں تھا۔

وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اپنے حسن سے مسحور کرلینا چاہتا ہو۔

تقریباً اس کی گرفت میں بیٹھے بیٹھے مجھے وہ سین یاد آیا جب بچپن میں ایک بار ماں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے پورب کی طرف کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ہماری گاڑی رات کو رکی تھی۔ ایک دیہاتی اپنی پتنی کو ٹھونسم ٹھانس بھرے ہوئے زنانے کمپارٹمنٹ سے اتارنے کیلئے ہانپتا ہوا اوپر چڑھا۔ دونوں نے مل کر ادھر ادھر تلاش کر کرکے گٹھریاں اور ٹین کے بکس نیچے اتارنے شروع کئے۔ مرد بچے کو لیکر تین سیڑھیاں نیچے اترا اور اسے گٹھری پر بٹھاکر دوبارہ اوپر

چڑھا۔ اسی وقت گاڑی چل پڑی۔ اندھیرے، بغیر پلیٹ فارم کے اسٹیشن پر ہمنے بچے کے رونے کی آواز سُنی، مرد شاید فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا کہ وہ چلتی گاڑی سے نیچے کود پڑے یا بیوی کے ساتھ رہے۔ کسی نے زنجیر کھینچنے کا مشورہ دیا۔ پہلے عورت اور پھر مرد نے بار بار زنجیر کھینچی۔ لیکن گاڑی انکی دشا سے بےپرواہ اسی طرح چلتی رہی۔

عورت رو رہی تھی۔ مرد اسے چمکار کر بولا:

"اگلے اسٹیشن سے بیل گاڑی کرکے واپس چلے جائینگے، رو کیوں رہی ہے۔ اتنی دیر تو بچے کی دیکھ بھال وہاں کوئی نہ کوئی کرہی لے گا"۔

مجھے مزاحمت کرتے نہ دیکھ کر ٹکٹ چیکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ یو ڈی کولون ایسا لگتا تھا اس نے کمپارٹمینٹ میں داخل ہونے سے پہلے اپنے سینے پر اچھی طرح چھڑکا ہے۔

میںنے اس کے ہاتھ کو اپنی ننگی کمر کے پیچھے سے گذر کر اپنے دوسری طرف کے کندھے پر بیٹھتا ہوا محسوس کیا۔ ٹرین کی رفتار میں ابھی تک فرق نہیں آیا تھا اور نہ ہی پٹریاں بدلنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی جو آنے والے اسٹیشن کا پتہ دیتی۔ میںنے اس کے بھاری جسم کو اپنے اوپر لچتے ہوئے محسوس کیا اور نجانے کس طرح ماؤف ہوتے ہوئے دماغ سے کام لیتے ہوئے ایک دم کہا:

"I am not clean" (میں صاف نہیں ہوں)

رازداری کی اس منزل پر پہنچ جانے کے بعد زور اور زبردستی غیر ضروری تھی۔ وہ ہنستا ہوا سامنے کی سیٹ پر بیٹھنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔

Scanned by CamScanner

اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں بھاگ کر اسی عورت کی طرح زنجیر سے لٹک گئی۔

اس کا آخری ادھورا جملہ "آپ کہاں رہتی ——"

"ارے ارے ٹھہرئیے" میں گڈ مڈ ہوگیا۔

اس نے مجھے زنجیر سے کھینچ کر علیحدہ کرنا چاہا۔

جنگل اور اندھیرے میں ایکاایکی ٹرین کے رکنے اور زنجیروں کے کھڑکھڑانے کی آواز پیدا ہوئی جیسے زنجیریں کھل کھل کر نیچے گر رہی ہوں۔ وہ میرے قدموں میں گر پڑا ——

میں رو رہی تھی اور ابھی تک میرے دونوں ہاتھ زنجیر کو پکڑے ہوئے تھے۔

اندھیری رات میں دو چار آدمیوں کے بولنے کی آوازیں نزدیک آنے لگیں۔ وہ بولا:

"مجھے معاف کر دیجئیے۔ کچھ مت کہئیے گا۔ خدا کے —— اپنے بھگوان کیلئے کچھ مت کہئیے گا"۔

اس وقت وہ لمبا تڑنگا گلابی سفید رنگت والا (شاید) خوبصورت نوجوان کمپارٹمینٹ کے فرش پر گرا ہوا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اتنا تو میں بھی اب سے چند لمحے پہلے نہیں ڈر رہی تھی۔

"خدا کیلئے ——"

ایک لمحے کیلئے مینے اس نفرت کو اپنے سینے میں کلبلاتے ہوئے محسوس کیا جس پر مجھے سدا میرے پڑھے لکھے ماں باپ نے اکسایا تھا اور جیسے میرے پتی دیو اور انکے ماتا پتا دھرم ہی کا حصہ سمجھتے تھے۔

میر ظہیر عباس روستمانی

Scanned by CamScanner

لیکن اسی وقت دروازہ باہر سے کھولنے کی آواز ہوئی اور ڈبے کے اندر کا ہینڈل خود بخود گھوم گیا۔ ٹکٹ چیکر یونیفارم جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کیلئے جدوجہد ختم ہوچکی تھی۔

میں نے کمپارٹمینٹ سے باہر دوسری طرف کے اندھیرے میں نظریں دوڑائیں۔ اس علاقے کے چپے چپے سے میں واقف تھی۔ دور جہاں جھونپڑیوں میں سے روشنی نظر آرہی تھی یہ وہی جگہ ہوگی جہاں میںنے موروں کو دن میں بارہا چگتے دیکھا تھا۔ ایک آدھ میل ادھر یا ایک آدھ میل آدھر، میں اس سے زیادہ کی غلطی نہیں کر رہی ہونگی۔

لیکن میں یہ سب کچھ بے موقع کیوں سوچ رہی تھی!

ریلوے گارڈ اور ریلوے پولیس کے سپاہیوں کی معیت میں ٹکٹ چیکر کمپارٹمینٹ سے نیچے اترا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے کترا رہے تھے۔ کچھ دیر تک ریلوے ٹریک کے پاس بچھے ہوئے پتھروں پر انکے بوٹس کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد زنجیروں کی چرچراہٹ کے ساتھ ٹرین دوبارہ چل پڑی۔

میں سب کچھ کرنے کو تیار تھی لیکن اپنے پتی کے کندھے سے لگ کر رو نہیں سکتی تھی۔ یوں بھی دونوں میں ذہنی مطابقت ہی کتنی تھی! انکا وہ کندھا میرے لئے چپٹ کر رونے کیلئے بے جان ہوتا۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے وہ دھرم پتر لاکھ ہی لگ رہے ہوں لیکن میرے لئے وہ نفرت کا دیوتا تھے۔ ایسا آدمی جو دوسرے انسانوں سے گروپس کی شکل میں بھی نفرت کرسکتا تھا اور انفرادی طور پر بھی۔ مثلاً انہیں نیچ جاتی بناکر، مسلمان بناکر،

اس اور آس ملک کا بناکر اور مجھ اکیلی سے کیونکہ میں نفرت جیسی نازک بھاؤنا اپنے کٹھور دل میں پیدا کرنے کے ناقابل تھی۔

وہ اس وقت سامنے بیٹھے کیا سوچ رہے ہونگے؟ اپنی بے عزتی کے بارے میں؟ جس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی تھی۔ ایک طرح کی خوشی؟ کہ جس نے میری عزت لوٹنی چاہی تھی انکی توقع کے مطابق دوسرے دھرم کا تھا۔ یا دہ کہ وہ بس جو آج کے بعد انکے من میں پھیلتا ہی جائیگا: 'کیا واقعی وہ مایکچھ کامیاب ہوگیا تھا؟'

دوبارہ اس ٹکٹ چیکر کو جب میں نے دیکھا تو وہ ہتھکڑیاں پہنے ہوئے تھا۔ ہمارے اسٹیشن پر اسے حراست میں لے لیا گیا۔ مجھے یونہی ایک بار پھر نزدیک جاکر اس کے سینے کو سونگھنے کا خیال آیا اور اس ڈر سے کہ اپنے اس خیال پر میری ہنسی نہ نکل جائے میں نے رونے والے انداز سے چہرے کو رومال سے چھپالیا۔

معمولی لکھا پڑھی کے بعد ہمیں گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

اس گنگا یاترا نے واقعی میری زندگی کا دھارا بدل دیا۔

پتی دیو خاموش رہنے لگے۔ ساس مجھ سے شودروں کا سا سلوک کرنے لگیں۔ پہلے اگر میں کبھی ہندو رواجوں کے خلاف بول لیتی تھی تو اب وہ بھی ختم ہوگیا۔ اگر میں ستی کے خلاف بھی بولتی تو اسے میری انگریزی تعلیم کا خراب نتیجہ سمجھا جاتا۔ میں گھر کی مورتی کے سامنے جاتے ہوئے بھی کترانے لگی تھی کیونکہ ایک دن رات کے اندھیرے میں کافی دیر تک خاموشی رہنے کے بعد ایک سوال گونجا:

Scanned by CamScanner

"اس نے تمہیں ہاتھ لگایا تھا؟" اس کے بعد سانس چھوڑنے کی آواز آئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے سوال کرنے والے کا سینہ عرصہ سے بھنچا ہوا تھا اور اب کہیں جاکر کھلا ہے۔

مجھے جج کے سوالوں کے جواب دینے پڑتے تھے، انکوائری کرنے والوں کے اور اب یہ آواز نجانے کہاں سے اندھیرے اور خامشی میں گونجی تھی۔

یقیناً یہ آواز میرے اندر کی دھرم ادھرم کا گیان کرنے والی آواز نہیں تھی۔ وہ بیچاری تو خاموش تھی۔ میرے ساتھ اس وقت کمرے میں صرف میرے پتی تھے، میرا ضمیر معصوم بچے کی نیند سو رہا تھا۔

وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر لیٹے ہوئے تھے کہ ہم ایک دوسرے کو ہاتھ بڑھاکر بھی نہیں چھو سکتے تھے۔

میرا جی چاہا ٹھٹھا مارکر ہنسوں اور پوچھوں

'تو سرکار آج تک اسی فکر میں غرق رہے ہیں کہ مجھے اس نیت سے جوکسی زمانے میں آپ کی ہونی تھی کسی دوسرے نے تو ہاتھ نہیں لگایا ہے'۔

اب بھی جب کبھی سیکنڈ ہینڈ کاروں کی فروخت کے اشتہار پر نظر پڑ جاتی ہے اور Owner Driven یا One Man Driven (صرف مالک کی چلائی ہوئی یا محض ایک آدمی کی چلائی ہوئی کار) کے الفاظ پڑھنے میں آجاتے ہیں تو مجھے اندھیرے میں کسی کے سانس چھوڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور اپنا وہ غیر ضروری جواب:

"نہیں۔ مجھے آپ کے سوا کسی نے نہیں چھوا ہے۔ میں نیشن کانک ہوں"۔

Scanned by CamScanner

تھوڑی دیر کے بعد انکے کروٹ لینے کی آواز آئی اور خرّاٹے جو 'ھری ـــــ اوم' کی لے ہر لئے جارہے تھے۔

لیکن اگر میں پوجا کے کمرے میں نہیں جاتی تھی تو ڈر لگتا تھا کہ لوگ مجھے ادھرمی سمجھینگے۔

ایک دن ہم لوگ جاڑوں کی دھوپ میں برآمدے میں بیٹھے تھے ۔ میں سوئیٹر بُن رہی تھی۔ ساس میرے پتی کے سر میں تیل لگا رہی تھیں اور سُسر روکنگ چیئر پر بیٹھے ھِل ھِل کر اخبار پڑھ رہے تھے۔ دوسری صبح عدالت میں میری پیشی تھی، اور یہ بات پورے خاندان کیلئے ھر مرتبہ عزت لٹ جانے کے برابر ھوتی تھی کہ خاندان کی بہو گھر سے تانگے میں بیٹھ کر عدالت جائیگی، جہاں مجرمانہ حملہ، خراب نیّت سے، عصمت دری اور اسی قبیلے کے دوسرے الفاظ اس سے پوچھے جائینگے۔ اور پورے وقت سُسر اور میرے پتی نظریں نیچی کئیے بیٹھے رھینگے۔ ایسے موقعوں پر دونوں مجھ سے زیادہ سے زیادہ دور رھنے کی کوشش کرتے تھے جیسے دنیا والوں کو بتا دینا چاھتے ھوں کہ اس عدالت کے قانون سے کہیں بڑھ کر ان کیلئے انکے دھرم کا قانون تھا اور عدالت خواہ کچھ بھی فیصلہ کرے میں ان کیلئے اس خوبصورت اور قیمتی شیشے کی ایش ٹرے سے زیادہ نہیں تھی جسے ٹوٹ جانے پر بھی گھر ھی میں پڑا رھنے دیا جاتا ہے لیکن جو کام میں بھی نہیں لائی جاسکتی ہے۔

خاموشی کو ختم کرنے کیلئے ساس نے اپنے بیٹے سے پوچھا

"کل وہ بات تو بیچ ھی میں رہ گئی تھی"۔

"کونسی؟" میرے پتی نے آلسی سے کہا۔

" ارے وہی تمہارے دوست کی دوکان بند ھو جانے کی"۔

"کچھ نہیں جھگڑا ہوگیا تھا اپنے ساجھے دار سے" میرے پتی نے جواب دیا۔

"وہ تو مجھے بھی پتہ ہے" میری ساس نے کہا۔ "لیکن جب دوکان کھولی تھی اس وقت تو انہیں اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آرہی تھیں"۔

میرے پتی نے میرے چہرے کو اس طرح دیکھا جیسے مجھ سے اس کا جواب طلب کرتے ہوں۔

"بھان متی کا کنبہ کہیں پھلا ہے آج تک!" میری ساس نے کہا۔

اب سسر کی کرسی بھی ہلنے سے رک گئی اور اخبار نیچے کرتے ہوئے وہ بھی مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں اس سے زیادہ سوئیٹر بننے میں منہمک نہیں ہوسکتی تھی جتنی نظر آرہی تھی۔ سب کو اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر میںنے بننے کی سلائی سے اپنی کنپٹی کھجاتے ہوئے وہ بات کرنے کی کوشش کی جو وہ میرے منھ سے سننا چاہتے تھے

"کسی مسلمان کو ساجھے دار بنانا ہی غلط تھا" تینوں کی نظروں میں شبہہ کی رنگت اور گہری ہو گئی۔

"کبھی۔ ان لوگوں پر، کبھی بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا" میں بولی

'You are telling a lie'

('جھوٹ بول رہی ہو') مجھے اپنے خیالات کی آواز سنائی دی۔

سسر خاموشی سے کرسی پر اخبار رکھ کر باغیچے میں چلے گئے۔ ساس کو رسوئی کا کوئی کام یاد آگیا،

Scanned by CamScanner

اور اپنے پتا کی کرسی پر بیٹھ کر ہل ہل کر میرے پتی اخبار پڑھنے لگے۔

میں جانتی تھی یہ لوگ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی میں اُن دنوں انکی ہی پسند کی باتیں کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ مثلاً: مسلمانوں کی رسومات کی ہنسی اڑانا، ان کی گندگی کا ذکر، یہ کہ میری سہیلی کے گھرمیں رسوئی میں سب جوتے پہنے چلے جاتے ہیں۔ اور باقی گھروالوں کی طرح مینے بھی اپنی نند کے سخت گیر سسر کو اورنگ زیب کہنا شروع کردیا تھا کیونکہ وہ سب کو نہ صرف ایک ہی لاٹھی سے بلکہ محض لاٹھی سے ہی ہانکتے تھے اور ہنسنے ہنسانے پر رلانے اور ترسانے کو ترجیح دیتے تھے۔

لیکن جب میری نند میکے آئیں اور مینے مذاق میں اُن سے پوچھا:

"اور اورنگ زیب جی کیسے ہیں؟"

تو کوئی ہنسا نہیں جیسے لطیفہ پرانا ہوگیا ہو یا بے موقع ہو۔

میری مسلمان دوست اب بھی مجھ سے ملنے کبھی کبھی آجاتی تھی۔ میں کوشش کرتی تھی وہ اکیلے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرے اور اسے وہیں بٹھاتی تھی جہاں ساس بیٹھی ہوتی تھیں۔ گفتگو کے درمیان اگر وہ انگریزی کا کوئی لفظ استعمال کر بھی جاتی تھی تو میرا اگلا جملہ لامحالہ کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ اس میں اس لفظ کا ہندی ترجمہ ضرور شامل ہوجاتا تھا۔ وہ اگر پوچھتی تھی:

"How is it going?" تو میرا جواب ہوتا تھا ــــ

"دیکھو ابھی کتنے دن عدالت جانا پڑتا ہے"۔

تھوڑی دیر اردو میں بات کرنے کے بعد بھک کر

اگر وہ witchcraft کا لفظ استعمال کر بیٹھتی تھی تو میں کہتی: "جادو ٹونے کی میں قائل نہیں ہوں۔ وہ لوگ ہونگے"۔

'وہ لوگ' سے مراد 'وہ مسلمان لوگ' ہوتے تھے اور اس غیر ضروری صفائی کے پیچھے شاید میرا یہ خوف چھپا ہوا تھا کہ یہ لوگ مجھے اتنے بڑے سانحے کے باوجود اس مسلمان لڑکی سے ملتے رہنے کی بنا پر اندر سے یا تو آدھرمی، یا مسلمان ہوجانے پر آمادہ یا کسی نہ کسی دن گھر چھوڑکر بھاگ جانے کو تیار سمجھے بیٹھے ہیں۔

ایسے موقع پر ساس وہاں سے ٹل جاتی تھیں اور پتی دیوتا اگر غلطی سے اس کمرے میں آجاتے تھے تو بے ضرورت کسی کتاب کے کہاں رکھے ہونے کا سوال کرکے فوراً باہر نکل جاتے تھے۔ وہ ہم دونوں سے نفرت کرتے تھے۔

ایک دن میں نے اس سے کہا "اس کے ساتھ عدالت میں ہمیشہ دو بوڑھے نظر آتے ہیں جنہیں دیکھ کر مجھے وحشت ہوتی ہے"

"یاجوج، ماجوج ہونگے" میری دوست نے کہا

"ایک کی شکل اس سے بہت ملتی جلتی ہے، وہی سرخ سفید رنگت، وہی اونچائی اور کاٹھی۔ صرف داڑھی زائد ہے"

"اس کا باپ ہوگا" میری دوست نے کہا

"اور دوسرا؟ جو زیادہ مخدوش نظر آتا ہے اور اس بات کا منتظر رہتا ہے کب مجھ سے اس کی نظریں ملیں۔ وہ بھی داڑھی والا ہے"۔

"اس کا سسر ہوگا"۔

"سسر نہیں ہوسکتا" مینے کہا "سسر کو میں

دیکھ چکی ہوں۔ سسر وہ ہے جسے میں نے اس کی بیوی کو بھٹی بھٹی کھ کر چپ کراتے دیکھا تھا جب وہ پہلی بار اپنے شوہر کو ہتھکڑیاں پہنے دیکھ کر سسک سسک کر رونے لگی تھی۔ کیا عورت ہے! پتہ نہیں میں اس کی جگہ ہوتی تو رو بھی پاتی یا نہیں؟"

"She must be nuts" (بالکل ہی گھامڑ ہوگی) میری سہیلی نے کہا

"تعجب یہ ہے کہ وہ الٹا مجھی کو ملامت کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہتھکڑیاں اس کا شوہر نہیں میں پہنے ہوئے تھی"۔

"جس طبقے کی اور جہاں کی وہ عورت ہے اس میں شوہر سدا معصوم رہتا ہے" میری دوست نے کہا۔

کمرے میں چند قانون کے رکھوالوں کے سوا ہم پانچ آدمی تھے میں اور میرے پتی، ٹکٹ چیکر اس کی نوجوان بیوی اور بیوی کا باپ۔

وہ تین اِس ادِن پر بھی ایک تھے۔

شاید وہ سوچ رہے تھے اس تمام خرابی کی ذمّے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ میں نے اس کے شوہر پر جھوٹا الزام لگایا ہے یا یہ کہ اگر واقعی ٹکٹ چیکر نے مجھ پر مجرمانہ حملہ کیا تھا تو بھی یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اس کیلئے اسے جیل بھیجا جائے۔

سسر اپنی بیٹی کو روتا نہیں دیکھ سکتا تھا اور بیٹی اپنے پتی کی دشا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا یہ واقعہ ان کی زندگی کے پانی پر پھیلی ہوئی کائی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا جسے ہٹاکر وہ نیچے کا صاف پانی پینے کو پھر سے تیار تھے۔

وہ مجھ سے سمجھوتا کرنا چاہتے تھے، بے عزتی کا حرجانہ عدالت سے باہر باہر دینے پر آمادہ تھے اگر میں یہ کہدوں کہ 'نہیں کوئی اور بات نہیں تھی رات کی تنہائی میں ایک مرد کو اپنے کمپارٹمینٹ میں داخل ہوتے دیکھ کر میں بس گھبرا گئی تھی اور بوکھلاہٹ میں زنجیر کھینچ بیٹھی تھی'۔

اس عورت کی نظروں میں میں نے لجاجت دیکھی، ملامت دیکھی لیکن ایسے موقع پر شوہر کیلئے جو جذبہ ہونا چاہئیے تھا وہ مجھے کوسوں نظر نہیں آیا۔

سمجھوتہ، رشوت اور معافی مانگنے کے علاوہ وہ مجھے تباہ کردینے کی بھی دھمکیاں دے رہے تھے لیکن تھے بہرحال ایک۔

اس کے برخلاف میرے اور میرے شوہر کی زندگی کے ٹھیرے ہوئے پانی میں جیسے کوئی جانور گر کر مرگیا تھا اور جیسے جیسے دن جارہے تھے اس کی لاش پھول اور پھٹ کر اوپر کو آتی جارہی تھی۔ اس پانی کو دوبارہ پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پہلی دو ایک پیشیوں کے بعد جن میں ٹکٹ چیکر صرف اپنے سسر اور وکیل کے ساتھ پیش ہوا تھا اور جو ایڈ جرنمنٹ کی منزل سے آگے نہیں بڑھ پائی تھیں تیسری پیشی پر نجانے کہاں سے ایک دم اس کے حمایتی اُبل پڑے۔ دیکھنے میں سب ایک ہی جیسے لگتے تھے۔ چوڑے چکلے سینوں والے بوڑھے اور نوجوان۔ ان کے سر پر پگڑ تھے جن کے بیچ میں سے سیاہ ٹوپیاں چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں اور سیاہ واسکٹوں پر سونے چاندی کی زنجیریں، سونے اور چاندی کے بٹنوں کے بیچ میں جھولتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ سب کے سب

سرخ اور سفید تھے اور چلنے میں ان کی شلواریں ہوا میں پھڑ پھڑاتی تھیں۔ ان کے سینڈلز تک ایک ہی طرح کے تھے۔ فرق مونچھوں اور داڑھیوں کے ہونے اور نہ ہونے کا تھا — یا عمروں کا۔

ان ہی میں وہ دو بوڑھے بھی تھے۔

وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں بھی لیکر آتے تھے اور ٹکٹ چیکر کو موقع ملتے ہی کچھ نہ کچھ کھلانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ٹکٹ چیکر کی بیوی کی طرح اس کے حال پر متاسف نظر نہیں آتے تھے لیکن ان کے چہروں پر اس کے مستقبل کی تاریکی کا خوف بھی دکھائی نہیں پڑتا تھا۔

وہ ٹکٹ چیکر کو مستقل مشورے دیتے رہتے تھے اور ساتھ ہی مجھے بھی دیکھنے سے نہیں چوکتے تھے۔ ایسے میں میرے لئے ایک ہی ردعمل باقی رہ جاتا تھا کہ میں ساری کے پلّو کو اور زیادہ مضبوطی سے سر پر مڑھ لوں اور سینے کو چھپانے کی کوشش کروں۔

عدالت میں میرا ہاتھ پکڑکر بیٹھنے والا کوئی اور نہ تھا۔ یوں بھی یہ مقدمہ تو میرے نزدیک اس رات میرے زنجیر کھینچنے کے بعد ہی ختم ہو چکا تھا۔ اس سے زیادہ کی نہ مجھے تمنا تھی نہ پرواہ۔

ان لوگوں کے یہاں آنے سے پہلے میں نے اڑتی اڑتی یہ خبر سنی تھی کہ اس کے گاؤں تار بھیجا گیا ہے اور اس کے ناتی پہنچنے ھی والے ہیں۔ بعد میں مجھے پتہ چلا ان دونوں بوڑھوں میں سے ایک اس کا باپ تھا اور دوسرے کوئی پہنچے ہوئے بزرگ۔

نمبر دو کو میں نے جب بھی دیکھا وہ مجھے بھیانک سے نظر آئے اور منھ ہی منھ میں کچھ بُدبُداتے رہتے تھے۔

Scanned by CamScanner

ان کی مونچھیں عجیب مضحکہ خیز طریقے سے ترشی ہوئی تھیں کہ اوپر کے ہونٹ کے تقریباً آدھ انچ اوپر سے شروع ہوتی تھیں۔ داڑھی سرخ تھی اور سر کے بال بھی، جو پگڑی کے نیچے سے گردن تک گھوڑے کی ایال کی طرح آگے ہوئے تھے، سرخ تھے۔

عدالت میں بیٹھے ہوئے جیسے وہ مجھے اپنی نظروں سے اپاہج کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی جب وہ اپنے دھیان میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے تو میں آنکھیں مچمچاکر انہیں دیکھ لیتی تھی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ کپڑوں اور بالوں کے نیچے چھپے ہوئے اس انسان میں اور کسی رشی منی میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ دونوں ہی کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی شانت اگنی ہوتی ہے۔ وہ خاص طور سے ٹکٹ چیکر کی مدد کیلئے بلائے گئے تھے اور بغیر ان کی طرف دیکھے ٹکٹ چیکر کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔

میری دوست نے بعد میں مجھے بتایا وہ کوئی خاص قسم کا وظیفہ پڑھنے کے ماہر ہیں اور یہ وظیفہ کالے رنگ کے مرغے کا گلا کاٹتے وقت پڑھا جاتا ہے۔ اس مرغے کو کوئی کھاتا نہیں ہے بلکہ گلا کٹ جانے کے بعد پھڑپھڑاتے ہوئے ہی کو گڑھا کھود کر اس میں دبا دیتے ہیں

کسی انجانے خوف سے میرا ہاتھ بے اختیاری طور پر میرے گلے پر گیا۔

"اور پڑھتے کیا ہیں؟" میں نے وحشت کو ہنسی میں ٹالتے ہوئے پوچھا۔

"بھگوان سے یا یوں سمجھو کہ اس کے مسلم کاؤنٹرپارٹ سے سہایتا مانگتے ہیں"۔

"اور وہ دیتا ہے؟"

" Sure " (یقیناً)

"ایسے موقع پر بھی؟" میں نے کہا۔ "یعنی ایسے لوگوں کو بھی؟"

اس نے تمسخر سے کہا "تمہارے خیال میں ایسے لوگوں کی سہایتا کیلئے کوئی دوسرا ہونا چاہئیے؟ مانگنے والا چاہئیے"۔

اب میں اس گھر میں بیگانوں کی طرح وہ رہی تھی۔ ایک بار خیال آیا جہاں سے یہ کتھا شروع ہوئی ہے وہیں اس کا انت بھی کر آؤں۔ کیوں نہ ایک گنگایاترا اور ہو جائے!

پھر سوچا اپنے شہر کی ندی ہی کیا بری ہے۔ ابھی تک تو ہر سال کسی نہ کسی نراش آتما کے کام آتی ہی رہی ہے۔

بیساکھ کی ایک صبح کو میں دریا کے پل پر گئی۔ نیچے جہاں اشنان گھاٹ تھا اس کے آس پاس عورتوں کی گہری پیلی اور سرخ ساڑیاں نظر آرہی تھیں۔ بچے کنارے پر بیٹھے پانی میں کنکریاں پھینک رہے تھے۔ پل کے نیچے دو چار لڑکے نہا رہے تھے اور ان کے کالے کندھے صبح کی دھوپ میں پانی سے ابھرے ہوئے چمک رہے تھے۔

میں نے یونہی ریلنگ پر سے ہاتھ آگے بڑھاکر کچھ پھینکنے والے انداز سے ہوا میں لہرایا۔

لڑکے "ماتاجی۔ماتاجی" چلائے اور پانی میں ہاتھوں کے چلانے کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچیں۔

مجھے اپنی سورگ باشی ماں یاد آگئیں اور اپنا بھائی جو اب جرمنی میں تھا۔ جوتا کہیں کا۔ اور چھوٹی بہن جو یو۔کے۔ میں تھی۔ اور پتاجی۔۔۔

پل پر کی ہوا بڑی ٹھنڈی اور سکھ دائیک تھی۔ میں نے پرس میں سے نکال کر جتنی بھی اکنیاں، دونیاں، چونیاں، اٹھنیاں تھیں ایک ایک کرکے پانی میں پھینکنی شروع کردیں۔ ہر سکے کے گرنے کے بعد لڑکے ناک پکڑکر پانی میں ڈبکی لگاتے تھے اور اوپر آکر مجھے وہی سکہ ہوا میں ہاتھ ہلاکر دکھاتے تھے۔

دوپہر تک میں بغیر نہائے واپس گھر لوٹ آئی اور سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مجھے نہیں معلوم تھا جتنے منھ اتنی باتیں والی کہاوت کسی نے صدیوں پہلے کسی ایسے ہی کورٹ میں بیٹھ کر کہی ہوگی۔ جو کہانی آہستہ آہستہ واقعات پر واقعات اور بیانوں پر بیانوں کے ردے بٹھاکر بنتی جارہی تھی اس تجربے سے کہیں زیادہ طویل اور مختلف تھی جنسے چند لمحوں میں اس رات مجھے گذرنا پڑا تھا۔

جب کسی نے میری کالج کی زندگی پر روشنی ڈالی تو میرے دھرم رکھشک پتی گپت بیٹھے رہے اور انکے پتاجی نے ایسا سانس لیا جیسے انکے شبہات آج پورے ہوئے ہوں۔

ٹکٹ چیکر نے اس بات کو تسلیم کیا کہ:

۱۔ وہ روشنی کے کھمبے سے ٹیک لگائے ضرور کھڑا تھا لیکن اصل میں وہ اپنے سرکاری کاغذات پُر کر رہا تھا۔

۲۔ یہ بات درست نہیں تھی کہ وہ کھمبہ عین زنانے کمپارٹمینٹ کے سامنے تھا۔

۳۔ بعد میں جب ٹرین چل پڑی تو اس نے ایک عورت کو پیچھے کے کسی ڈبے سے دروازہ کھول کر باہر

نکالتے ہوئے دیکھا تھا جو کم عمر تھی۔ لیکن خوبصورت تھی یا نہیں اس کا اندازہ وہ نہیں کرسکا تھا۔

۴۔ اسے ایک دم ایسا لگا تھا جیسے وہ عورت خودکشی کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ جب وہ ڈبہ اس کے سامنے سے گذرا تو ہینڈل پکڑ کر وہ فٹ بورڈ پر کھڑا ہو گیا اور عورت کو، یعنی مجھے، دھکا دیکر وہ اندر گھس آیا تھا۔

۵۔ اس وقت میں رو رہی تھی۔ کیونکہ میرے پتی مجھ سے بیزار تھے اور میرے بانجھ ہونے کی وجہ سے نہ صرف وہ بلکہ میرے ساس سسر تک مجھ سے ناخوش تھے۔

۶۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ اس سے پہلے بھی میں بارہا خودکشی کی کوشش کر چکی تھی اور اس گنگاپاترا کے بعد بھی اگر میں ماں نہ بنی تو میرا جینا نہ جینا بیکار ہوگا۔

ان میں سے بہت سی باتیں سچی تھیں۔ مثلاً یہی کہ میں بانجھ تھی اور مقدمے کے دوران بھی مجھے بجائے اشنان کرنے کے پل پر ٹہلتے دیکھا گیا تھا۔

لیکن ریلوے گارڈ کے بیان سے یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ جب ٹرین رکی تو ٹکٹ چیکر مجھے کودنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے نیچے گراکر وہ میرے اوپر جھکا ہوا میرے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ اس مسلمان گارڈ نے مجھے زنجیر سے لٹکتے ہوئے دیکھا تھا!

مقدمے کا فیصلہ نہ کسی کے حق میں ہوا نہ خلاف۔ میں اور وہ ٹکٹ چیکر دونوں باعزت طور پر کورٹ سے باہر نکل آئے۔ میرے پتی اور انکے پتا ناخوش تھے کیونکہ

وہ میری وجہہ سے نہ سہی دھرم کی خاطر ضرور اس ٹکٹ چیکر کو جیل جاتے دیکھنا چاہتے تھے۔

عدالت کے باہر میں اکیلی کھڑی تھی۔

ٹکٹ چیکر کو اس کے ساتھیوں نے گھیر رکھا تھا اور لوگ اس کے باپ کو اور آن بزرگ کو پھولوں کے گجرے پہنا رہے تھے۔

پل بھر کو وہ آن دیکھا سین میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا ــــ

کچھہ لوگ ہیں جو بڑی عقیدت سے ایک گڑھا کھود رہے ہیں، پھر ٹکٹ چیکر آن بزرگ کے ھاتھوں میں ایک سیاہ چمکیلا مرغا دے دیتا ہے اور ٹکٹ چیکر کا باپ ایک بہت بڑا چھُرا۔ وہ کچھہ پڑھہ رہے ہیں ــ مجھے مرغے کے نڑخڑے سے خون کی پھوہار اٹھتی ھوئی دکھائی دی اور سانس کا پھنکارہ۔ چھن بھر بعد وہ پروں کے پھڑپھڑانے کی صدا اور خود سیاہ پر پیلی مٹی میں دب چکے تھے ــ جیسے وہ سب مل کر پہلے ھاتھوں سے اور پھر پیروں سے دھپ دھپانے لگے۔

پھر میں اپنے آپے میں آگئی۔ یہ تو دھرم کا باہر کا روپ تھا، چمتکار ــ

■ ■ ■

دریا کا پانی گدلا تھا اور اس میں جگہہ جگہہ تیل کے بڑے بڑے دھبّے بہتے ھوئے نظر آرہے تھے۔ اوپر کے رخ پر جدھر سے دریا بہتا ہوا آیا تھا پل کا سایہ نیچے پانی میں ھلکورے لیے رہا تھا۔ کبھی کوئی ٹگ بوٹ سامنے سے گذر جاتی تھی یا جہاز کی سیٹی کی آواز زور سے سنائی دیتی تھی، گھوں اوں اوں ــــ

Scanned by CamScanner

بیئر کی ایک خالی بوتل دور تیرتی ہوئی جارہی تھی۔ میں سکتہ ہاتھ میں اٹھاکر رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک بیئر کا خالی کین (ڈبہ) بہتا ہوا میرے سامنے سے گذرا جیسے کسی نے پل پر سے پھینکا ہوگا یا کسی جہاز سے۔

سکتے سے اس کا نشانہ لیکر میں نے کہا "Amstel" (یعنی ایمسٹل بیئر کا ڈبہ ہے میں شرط لگاتی ہوں)۔

"No, Heineken!" اُس نے پیچھے سے کہا (نہیں ہائینے کین کا ڈبہ ہے، ایمسٹل کا نہیں)

سکتہ ڈبے سے ٹکرایا، آواز پیدا ہوئی، اور ڈبہ پانی میں گھوم گیا۔ اس پر چھپا ہوا نام اسی ایک لمحے میں میری نظروں کے سامنے سے گذر گیا۔

میں نے فتحمندانہ لہجے میں کہا "دیکھا ایمسٹل تھا"

ہم دونوں ہنس پڑے۔ یہ کھیل دریا کے کنارے اگی ہوئی گھاس پر بیٹھ کر کبھی کبھی ہم کھیلا کرتے تھے بالخصوص جب کہرا نہ ہو۔

اور آج کی شام تو بہت ہی خوبصورت تھی۔ دریا کے دونوں کناروں پر یورپین، ایشین اور افریقی بچے گھاس پر دوڑ رہے تھے اور ڈھالوں پر لڑھک رہے تھے۔ انکی مائیں مدہم دھوپ میں بیٹھی اخبار پڑھنے، یا بن آکیولرز سے آتے جاتے جہازوں کو دیکھنے میں مصروف تھیں۔ کچھ بہت چھوٹے بچے پریمز میں سو گئے تھے۔

"ایک راؤنڈ اور ہوجائے" میری ویسٹ انڈین دوست نے کہا۔

میں نے کہا "آج کیلئے اتناہی کافی ہے، ابھی گھر پہنچ کر مجھے بچوں کیلئے کھانا پکانا ہے۔ میرے ہسبنڈ آج نائیٹ کال پر ہیں اور چونکہ آج میرا لکی ڈے ہے اس لئے

امید ہے ہر پانچ منٹ پر کسی کے زیادہ پی جانے پر ہسپتال لائے جانے کا ٹیلی فون نہیں بجے گا"۔ پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا "تمہارا اسکور چار ہے، میرا سات۔ پانچ سکّے تمہارے اور دو میرے دریا ہضم کر گیا"۔

وہ بھی سلیکس جھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی

"تمہارا نشانہ اتنا اچھا ہے کہ یقین نہیں آتا"

میں نے پوچھا "کاہے کا؟"

"یہی کہ تم ابھی تک گوشت نہیں کھاتی ہو"۔

"اس میں گوشت کھانے کی بات نہیں ہے" میں نے کہا "میری عادت بچپن سے پانی میں سکّے پھینکنے کی ہے"۔

پورنماسی ـ اماوس

ا

پلیا کے سامنے جہاں املی کا بڑا درخت تھا اور چھایا گھنی تھی ڈاکٹر نے اپنی میز کھول کر بچھائی اور کرسی کھول کر اس پر بیٹھ کر مریض کا انتظار کرنے لگا۔

چیت ختم ہو رہا تھا لیکن ابھی لُو چلنی نہیں شروع ہوئی تھی۔

اس کے سامنے اس کے اوزار بکھرے ہوئے تھے جو چھوٹے چھوٹے اور چمکدار تھے اور میز کے برابر میں اس کا تھیلہ رکھا تھا جس میں پانی ٹھنڈا رکھنے کی بوتل اور دوپہر کے کھانے کے ٹین تھے۔ وقت گذارنے کیلئے وہ اخبار پڑھنے لگا۔

لیکن ابھی مشکل سے وہ پندرہ، بیس منٹ بیٹھا ہوگا کہ اسے پلیا کی سمت سے ایک ہاتھی اپنی طرف آتا نظر آیا جس کے دونوں طرف جنگلی کتے تھے اور یوں بھی وہ نزار نظر آتا تھا۔ اس کے قدم تھکے تھکے تھے اور سر خود اپنے بوجھ سے نیچے کو ڈھلک آیا تھا۔

ہاتھی کو میز کے پاس کھڑا کرکے کتے اس کے چاروں طرف خاموشی سے بیٹھ گئے۔

Scanned by CamScanner

ہاتھی کراہ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے اُس سے پوچھا "کہاں تکلیف ہے؟" حالانکہ ہاتھی خود مجسم تکلیف تھا۔

ہاتھی نے بمشکل اپنا سر اوپر اٹھایا اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھول کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس میں نہ توانائی تھی اور نہ ہی وہ عام ہاتھیوں کی طرح جھوم رہا تھا۔

یکبارگی اُس نے ڈاکٹر سے پوچھا "تم نے جانورانی کہاں سے سیکھی؟"

ڈاکٹر نے کہا "آپ کا کیا خیال ہے؟"

ہاتھی نے کہا "میرا خیال ہے تم حضرت سلیمان کی اولاد میں سے ہو"۔

پیڑ میں سے آواز آئی "سولومن کہو، سولومن۔ بیوقوف جاہل"۔

ڈاکٹر نے سر اوپر اٹھاکر دیکھا جہاں ایک بڑا سا سفید طوطا ایک ٹہنی میں اپنے پنجوں کا چھلا بناکر گول گول اوپر نیچے گھوم رہا تھا جس طرح میلوں میں بچے اوپر تلے جانے والی سیٹوں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا تھا موسم کی وجہ سے سفید طوطا بہت خوش ہے۔

اُس نے ایک بار پھر کہا "سولومن۔ صحیح لفظ سولومن ہے گھامڑ!"

ہاتھی نے جواب دیا "مجھے معلوم ہے تم بھی سرکس سے چھوٹ کر یہاں آگئے ہو، اور ہو کسی اور ملک کے۔ تم یہاں کے معاملات کو کیا جانو۔

ہاں تو ڈاکٹر تم حضرت سلیمان کی اولاد میں سے ہو؟"

ڈاکٹر نے 'ہاں' میں سر ہلایا اور اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے بولا "کہاں تکلیف ہے؟"

"دانتوں میں"۔

"کونسے؟" ڈاکٹر نے کہا

"بھی جنہیں دکھانے کے دانت کہا جاتا ہے"۔

"یہ تو بُرا ہوا" ڈاکٹر نے دلی ہمدردی سے کہا اور اس کے دانتوں پر اپنی ربڑ کی ہتوڑی ماری جس پر ہاتھی کی دبی دبی چیخ نکل گئی۔

"کب سے ہے یہ تکلیف؟ عزت ماٰب...."

"جب سے یہاں پنگلیا کے نیچے نظربند ہوں اور مجھے عزت ماٰب مت کہو۔ میں عزت غرقاب ہوں"۔

"ہوں" ڈاکٹر نے کتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جنہوں نے اس گفتگو پر اپنے کان کھڑے کرلئے تھے اور ناخوش نظر آتے تھے۔

ڈاکٹر اپنے کام میں لگ گیا۔ واقعی میں دانت بہت خراب ہوچکے تھے انکی جڑوں میں سے خون اور پیپ نکل رہے تھے۔

مسوڑھوں کے اندر چھپی ہوئی پیپ کی تھیلیوں کو ڈاکٹر نے اپنے چھوٹے سے سرجیکل چاقو سے کھولنا چاہا تو ہاتھی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"I am Sorry" (میں معافی چاہتا ہوں) ڈاکٹر نے کہا اور تھیلے میں سے ایتھل کلورائیڈ اسپرے نکال کر دانتوں کی جڑوں پر اس کی پھوہاریں چھوڑیں اور کھال کے سن ہوجانے پر چاقو کھال میں دھنسا دیا۔ وہاں جیسے پیپ اور خون کا دریا بند تھا جو ایک دم پھٹ پڑا اور سُرخ مواد اس کے نیچے کے جبڑے پر بہنے لگا۔

Scanned by CamScanner

ہاتھی نے تکلیف کم ہوجانے پر پھنکار لی جیسے اُسے عرصہ بعد سکون ملا ہو۔ ڈاکٹر گھاس اور املی کے پتوں سے اس کی باچھیں صاف کرنے لگا۔

"تم ویٹ ہو؟ جانوروں کے ڈاکٹر؟"

"نہیں" ڈاکٹر نے کہا "میں یوں سمجھئیے تھوڑا دماغ کا ڈاکٹر اور تھوڑا Ethologist (ایتھالوجسٹ) ہوں"

"Ethologist! (ایتھالوجسٹ)!" بڑے دانتوں والے نے کہا "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"جو جانوروں کی حرکات اور سکنات اور عادتوں اور خوفوں کا مطالعہ کرتا ہے" ڈاکٹر نے کہا۔

"اِن جانوروں کے ہاتھ کہاں سے لگ گئے؟" ہاتھی نے پوچھا۔

"میں یہاں پاس ہی کے گاؤں میں دورے پر آیا ہوا ہوں اور اس علاقے کے لوگوں میں خوف کا سروے کر رہا ہوں۔ آج صبح جب میں منھ ہاتھ دھونے پاس کی ندی پر گیا تو ایک گیدھ نے جو شاید عرصہ سے کسی مجھ ہی جیسے کی تلاش میں تھا میرے پاس آکر کہا

'ایک بیمار ہاتھی کو دیکھنے چل سکتے ہو؟'

میں نے پوچھا 'اُسے کیا ہوا ہے؟'

اُس نے کہا 'اُس کے دانت خراب ہیں اور جانوروں کی ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوچکا ہے کہ اُسے یہ سہولت مہیا کی جانی چاہئیے۔ حالانکہ ــــــ'

'میں نے گدھ سے پوچھا 'حالانکہ کیا؟'

گدھے نے کہا 'میں کہنے والا تھا حالانکہ دانتوں کے ٹھیک ہونے کی اسے چند دن بعد ضرورت نہیں رہے گی'

میں نے پوچھا 'کیوں؟'

اس نے کہا 'اس لئیے کہ دو چار دن بعد اس کے یہ دانت کسی اور کے لگا دئیے جائینگے'۔

میں نے کہا 'اور وہ بن دانتوں کے کیسے درختوں کی جڑیں کھودے گا اور اپنی حفاظت کرے گا؟'

گدھے نے کہا 'تب تک وہ اپنی حفاظت اور پیٹ بھرنے سے بھی بے نیاز ہوچکا ہوگا'

میں معاملے کو سمجھ گیا اور تم جانتے ہو میرے پرکھوں میں حضرت سلیمان بھی شامل تھے اس لئیے میں نے فوراً اپنا تھیلہ اٹھایا اور یہاں چلا آیا"۔

کام ختم ہو چکا تھا۔ دھوپ میں کچھ کچھ تیزی آ چلی تھی۔ ڈاکٹر نے پانی پیا اور ایک ٹین کھول کر اس میں سے کچھ کھایا اور کتوں کی طرف دیکھتے ہوئے تھوڑا سا ھاتھی کو بھی چکھایا۔

کتّے ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ڈاکٹر کی وزٹ ختم ھو چکی ہے اور اب ھاتھی کو دوبارہ پُلیا کے نیچے جانا ھے جس کے اوپر سے کسی زمانے میں ایک سڑک گذرتی تھی۔

اس نے ڈاکٹر سے 'شکریہ' کہا جس پر درخت پر سے سفید طوطے نے کہا

"Say thank you, you dumb!"

(تھینک یو کہو۔ غبی کہیں کے!)

ہاتھی نے جو اب توانائی محسوس کر رہا تھا ایک مختصر سی چنگھاڑ درخت کی طرف سونڈ اٹھاکر ماری اور آدمی کے ہاتھ سے اپنی سونڈ ملاکر پٹلیا کی طرف چل پڑا۔

۲

اگلی صبح جب ڈاکٹر ہاتھی کو دیکھنے آیا تو بڑے دانتوں والا وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ کتّے کسی قدر لاپرواہی سے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ میں مصروف تھے، پٹلیا کے اوپر اور املی کی شاخوں پر اکّا دکّا چیتے نظر آرہے تھے اور ہوا سے کبھی کبھی املی کا کوئی کٹارا نیچے گر پڑتا تھا جسے ہاتھی اٹھاکر منھ میں رکھ لیتا تھا۔

ہر طرف سناٹا تھا

لیکن پہرہ نہ ہوتے ہوئے بھی ڈاکٹر اور بڑے دانتوں والے دونوں کو پہرے کا احساس تھا۔ کبھی کوئی لومڑی کسی جھاڑی میں سے منھ نکال کر دیکھ لیتی تھی کبھی کوئی بھیڑیا دور کسی جھاڑی کے پیچھے اِدھر ہی کو دیکھتا ہوا چلتا نظر آتا تھا۔ اور گیدڑ دور کے درختوں کے سائے میں لیٹے نظر آرہے تھے۔

ڈاکٹر نے اپنا کام شروع کرتے ہوئے پوچھا "کل عزت مآب آپ نے پوچھا تھا میں ان کے ہتھے کہاں سے چڑھ گیا۔ آج بھی سوال میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ

اس علاقے میں تقریباً تیس سال ہوئے آخری ہاتھی مارا گیا تھا"

"یہی میری بدبختی تھی کہ وہ مارا گیا تھا" بڑے دانتوں والے نے کہا۔

"وہ کیسے؟" ڈاکٹر نے جانورانی میں کہا "معاف کیجئیے گا میری ہانھیز کمزور ہے بولنے کا موقع ہی نہیں ملتا، اس لئیے اگر جانورانی ہی میں گفتگو ہو تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

بڑے دانتوں والے نے 'نہیں' میں سر ہلایا۔

دوبارہ ڈاکٹر نے ربڑ کی ہتوڑی باری باری سے دونوں باہر نکلے ہوئے دانتوں پر ماری۔ ہاتھی کسمسایا۔ ڈاکٹر نے کہا

"اتنے بڑے دانت میں نے آج تک نہیں دیکھے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی ہاتھیوں والے ملک کے شہر میں ہوں اور یہ وہ مصنوعی دانت ہیں جو لوہے کی چادروں سے بنائے جاتے ہیں اور اُن پر سفید پینٹ کیا جاتا ہے تاکہ اُن کی محرابوں کے نیچے سے ٹریفک گذرا کرے"۔

ہاتھی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ "تم اپتھولوجسٹ ہو، ویٹ (Vet) نہیں۔ ورنہ سمجھ سکتے تھے یہ تمام کے تمام میرے اپنے دانت نہیں ہیں۔ میرے اپنے دانت تو بہت چھوٹے چھوٹے اور ان بڑے دانتوں کے اندر بند ہیں۔ جتنے بڑے سیلون کے ہاتھیوں کے ہوتے ہیں"

"تو آپ کا تعلق سیلون سے ہے"۔ ڈاکٹر نے دانتوں کی جڑوں کی کُھرچائی (Scaling) کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اچانک چونک کر بولا

"That is too bad" (یہ تو بہت بُرا ہوا)

ھاتھی نے گھبرا کے پوچھا "کیا؟"

"آپ کے مصنوعی دانت اصلی دانتوں پر گرافٹ ہو گئے ہیں"

"یعنی؟"

"انہوں نے اصلی دانتوں پر اپنی جڑ پکڑ لی ہے اور اب اکھاڑے انہیں اکھڑینگے۔ تمام مادہ اس گرافٹ کے نیچے ہے اور میرے اسکیلپلز (Scalpels) اور فورسیپز (Forceps) یہ کام انجام نہیں دے پائینگے"۔

ایک لومڑی جو بڑے غور سے انکی باتیں تھوڑی دیر سے سن رہی تھی ڈاکٹر کا فیصلہ سنکر بھاگتی ہوئی اس طرف گئی جدھر بھیڑئیے، دوسری لومڑیاں اور لکڑبگھے بیٹھے تھے جیسے انہیں یہ اہم خبر سنانے گئی ہو۔

بڑے دانتوں والا افسردہ سا ہو گیا اور بولا "مجھے امید تھی تم انہیں جدا کر سکو گے تاکہ میں انہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں، جب یہ نہیں ہونگے تو یہ سب میری جان کے لاگو بھی نہیں رہیں گے"۔

ڈاکٹر غیر ضروری طور پر دانتوں کی صفائی اور انکی ٹھوکا پیٹی میں مصروف تھا تاکہ بڑے دانتوں والے سے جانوروں کے اس عجیب و غریب عمل کے بارے میں پوچھ سکے جو اس نے صرف انسانوں کی دنیا میں ہوتے ہوئے سنا تھا۔

ھاتھی نے سرگوشی میں کہنا شروع کیا "تقریباً دس سال ہونے کو آئے جب میں اپنی بیوی کے ساتھ سرکس سے چھوٹ کر بھاگا تھا کیونکہ وہاں ایک نیا سخت مزاج ٹرینر (Trainer) آگیا تھا اور اس نے میرے دس ھی سال کی سرکس کی زندگی کا خاتمہ کردیا۔

اگر میں وہاں سے نہ بھاگتا تو ہم دونوں یقیناً ایک نہ ایک دن اس ڈریئر کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے۔

ویسے مجھے وہ سفید اینگلو انڈین لڑکی ابھی تک یاد آتی ہے جو ایک مین میں میرے دانتوں پر لیٹ جاتی تھی اور میں اسے پھولوں کی طرح سنبھالے پورے رنگ کا چکر لگاتا تھا۔ اس وقت اس کی ننگی ٹانگیں میرے دانتوں کے ایک طرف اور ننگے بازو اور کندھے دوسری طرف ہوا میں جھول رہے ہوتے تھے اور وہ اپنے ہاتھ اپنے ہونٹوں سے چھوا کر ہوا میں بلند کرتی جاتی تھی۔ وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی تھی اور اس کے جسم سے اٹھنے والی خوشبو اس وقت میرے دماغ میں تھوڑی دیر کو بس جاتی تھی جب میں اسے سونڈ سے اٹھاکر زمین پر کھڑا کردیتا تھا اور وہ میری سونڈ کو پیار سے تھپکتی تھی۔

بہرحال ہم دونوں وہاں کے دس سالوں پر لات مار کر بھاگ کھڑے ہوئے اور اگنک پھر کر ادھر اگنک اور انمج کے بیچ کی کھادر میں چلے آئے جہاں میرا خیال تھا آئیندہ دن سکون سے گذارے جا سکینگے کیونکہ ہر طرف گنوں کے کھیت تھے، کیلا تھا، انناس تھا، اور بھٹے تھے اور دونوں ندیوں کے کنارے اتنے اچھے خربوزے اور تربوز ریت پر آرام کر رہے تھے جن کا تصور بھی ہم سرکس کی زندگی میں نہیں کرسکتے تھے۔ وہاں کیا تھا، موٹے موٹے روٹ، کبھی کبھار بے رس کے گنے یا لوگوں کے پھینکے ہوئے بسکٹ۔ یہاں مونگ پھلی کی جھاڑیاں تھیں، جھڑبیری اور تالابوں میں سنگھاڑے۔

ایک صبح جب روپا سو رہی تھی اور میں اگنک میں نہانے جارہا تھا تو وہاں میں نے اپنی زندگی کی سب سے عجیب چیز دیکھی جسے دیکھ کر چھن بھر کو میری سانس

سونڈ میں رکی کی رکی رہ گئی۔ ایک بہت بڑے درخت کے دوشاخے میں اتنی اونچائی پر جہاں میری سونڈ کی انگلی تک نہیں پہنچ سکتی تھی میں نے ایک بہت بڑے ہاتھی کا سر پھنسا دیکھا۔ اس کی سونڈ زمین کی طرف لٹک رہی تھی دانت بھی جو اب میرے ہیں دوشاخے میں سے سونڈ کے دونوں طرف برچھیوں کی طرح ہوا میں اٹھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن سر اتنا بڑا تھا کہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

ڈاکٹر نے دانتوں کی جڑوں میں ایک پیلی دوائی بھرتے ہوئے پوچھا "آپ کے سر سے بھی بڑا!؟"

"پاگل مت بنو ڈاکٹر۔ میرا سر اندر سے بہت چھوٹا ہے اور جسم بھی اتناہی چھوٹا ہے"۔

ڈاکٹر نے کہا "میرا خیال ہے یہ تمام زائد جسامت شاید اڈیما کی وجہ سے ہے۔ پانی بھر گیا ہے"

پھر خود ہی بڑ بڑاتے ہوئے وہ بولا "لیکن اس سے جسامت کیسے بڑھ جائیگی!" — "میرا خیال ہے آپ کو ایکرومیگیلی ہے"

ہاتھی نے ہاتھینیز میں جھلاہٹ سے کہا "مجھے کوئی گیلی ویلی نہیں ہے۔ ان کمبختوں نے میرے جسم میں ہر ممکن سوراخ سے مجھے اپنا بادشاہ بنانے وقت ہوا بھری تھی"۔

ڈاکٹر کا چشمہ ایک دم ناک پر اس طرح پھسل پڑا جیسے سلائیڈر پر بچے پھسلتے ہیں۔ اس نے ٹھنڈا پانی نکال کر تھوڑا خود پیا تاکہ حواس درست ہوسکیں اور باقی پانی اس نے بڑے دانتوں والے کی سونڈ اٹھاکر اس میں انڈیل دیا جسے اس نے شکریہ میں سر ہلاتے ہوئے منہ میں لوٹ دیا

میر ظہیر عباس روستمانی

Scanned by CamScanner

اور ھونٹوں پر آس ٹھنڈے پانی کی تری پیدا کرنے کیلئے آن پر زبان پھیرنے لگا۔

پھر وہ چونک کر بولا ”لیکن ابھی اصلی بات تو تمھیں میں بتانا بھول ہی گیا۔

دو شاخے میں صرف ھاتھی کا سر ھی سر تھا۔ پیڑ کے پیچھے اس کا دھڑ نہیں تھا۔

کون اتنے بڑے سر کو اٹھاکر وہاں رکھ سکتا تھا؟ کس کا سر تھا؟ میں عادتاً اپنی دونوں پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ھو کر اس بے جسم کے سر کو غور سے دیکھنے لگا کہ اس کے کیا معنی ھوسکتے تھے؟

تب ھی پیچھے سے ایک آواز آئی 'تو تم یہ بھی کرسکتے ھو؟'

میں نے پوچھا 'کیا؟' اور پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

میرے سامنے ایک بوڑھی لومڑی کھڑی تھی۔

اس نے کہا 'یہی۔ پچھلی ٹانگوں پر آدمیوں کی طرح سیدھا کھڑے ھوجانا'۔

میں نے کہا 'دیکھو میں ایک بھٹکا ھوا ھاتھی ھوں اور کچھ ایسی چیزیں کرسکتا ھوں جو دوسرے نہیں کرسکتے ہیں۔ یعنی اس سے زیادہ بھی کچھ کرسکتا ھوں'

اس نے کہا 'اچھا تو کرکے دکھاؤ'

میں اگلی ٹانگوں پر کھڑا ھوگیا

اور اس نے کہا 'تم ھی وہ ھو میں جس کی تلاش میں تھی'۔

میں نے کہا 'کس لئیے؟'

'ھمارا بادشاہ بننے کیلئے۔ کیا تم تقریر کر سکتے ھو؟'

میں نے کہا 'جب تم مجھے تقریر کرتے سنوگی تو سمجھوگی شاید تقریر کرنے کے سوا مجھے کچھ آتا ہی نہیں ہے' کیونکہ ڈاکٹر حقیقت یہ ہے کہ سرکس میں میں کام ہی یہ کرتا تھا۔ مختلف قسم کی آوازیں نکالنا، چنگھاڑیں، موٹی پتلی آوازیں اور لوگ بغیر انکا مطلب سمجھے ہوئے ھنستے تھے اور تالیاں بجاتے تھے حالانکہ میں اس وقت ھاتھینیز اور وہ بھی سیلونیز ھاتھینیز (سیلون کی ھاتھیوں کی زبان) میں جسے میری جیون ساتھی بھی نہیں سمجھتی ہے انہیں بے وجہ کوس کاٹ رھا ھوتا تھا۔

میں نے لومڑی سے پوچھا 'لیکن تمہارے یہاں شیر نہیں ہیں ٹائیگر یا کیر کے ببر شیر جو تم ایک ھاتھی کو بادشاہ چننے کیلئے آئی ھو؟'

یہ کہتے وقت میں بمشکل اپنی خوشی کو روک پارہا تھا۔

اُس نے کہا 'آخری شیر تو کیا آخری ھاتھی تک کو مرے ھوئے لگتا ھے صدیاں بیت گئیں'۔

میں کہنے ھی والا تھا کہ 'اور یہ سر........؟'

لیکن میری بات آدھر ہی میں رہ گئی اور وہ مجھے بادشاہت کے اصول سمجھانے لگی۔ چنانچہ وہ بات معمّہ ھی رہ گئی۔

کچھ دیر بعد جب وہ لوٹی تو میں اور روپا دونوں نہائے دھوئے تیار کھڑے تھے۔ لومڑی کے ساتھ بہت سے دوسرے جانور تھے بھالو، بھیڑئیے، گیدڑ، جنگلی کتّے وغیرہ جنھوں نے مجھے چاروں طرف سے گھوم پھرکر دیکھا اور اثبات میں سر ھلایا جیسے کہہ رھے ھوں 'چلے گا'

پھر انہوں نے بغیر میرے بارے میں کچھ پوچھے ہوئے کہ بادشاہت کا کچھ تجربہ بھی ہے یا نہیں؟ میں کہاں کا رہنے والا ہوں؟ وغیرہ وغیرہ، بغیر میری اجازت کے میرے جسم کے ہر ممکن سوراخ میں سے مجھ میں ہوا بھرنی شروع کردی — اپنی تھوتھنیوں سے بھی اور دوسرے طریقوں سے بھی جس سے مجھے سخت ایذا پہنچی۔

پھر وہ ہمیں لیکر اس طرف پہنچے جہاں وہ سامنے مٹی کی پہاڑیاں ہیں جن میں گپھائیں ہیں اور راستے اور میں نے دیکھا ہر پہاڑی اور راستے اور پگڈنڈی پر جانوروں کا ہجوم تھا — خرگوش، سیئی، ہرن، چکارے، پاڑھے، مور، گاہریاں، بندر، کھانکڑ چیتل، اور نیل گائیں — اور میرے چاروں طرف لومڑیاں تھیں، انکے باہر کے دائرے میں بھیڑئیے، ان سے باہر لکڑبگھے (ہائینا) اور بھالو، جیسے یہ میری حفاظت عام جانوروں سے کر رہے ہوں حالانکہ موروں اور چیتاوں سے مجھے کیا خوف ہوسکتا تھا!

راستے بھر میرا تعارف جانوروں سے ائیراوت کہہ کر کرایا گیا۔ یہ جانور معصوم تھے اور مسرت سے سرشار اور شاید عرصہ سے بغیر کسی لیڈر کے تھے۔

ایک موڑ پر مجھے ایک بوڑھا اندھا گھولر بندر نظر آیا جو میرے نزدیک پہنچنے پر دو ٹانگوں پر اٹھکر کھڑا ہوگیا اور گلوگیر لہجے میں بولا

'کہاں ہے میرا بادشاہ۔ میں نے پوری زندگی اپنے اس بادشاہ کا انتظار کیا ہے جو اس جنگل میں امن و امان کی بحالی کریگا اور دھرتی کے اس ٹکڑے پر انصاف کو پھر سے جنم دے گا اور حضرت سلیمان کی بادشاہت پھر سے زمین پر اترے گی۔ کہاں ہے میرا بادشاہ؟ مجھے اسے ہاتھ لگاکر دیکھنے تو دو'

یہ مجھے بعد میں پتہ چلا لومڑیوں نے اس اندھے بندر کو پہلے ہی سے اس موقع کی جگہہ پر سوچ سمجھ کر بٹھایا تھا۔

اندھے بندر کی باتیں سنکر دوسرے بندر بھی پیڑوں پر سے نیچے اتر آئے اور انہوں نے زمین پر سیس نیواکر مجھے دھنیہ کہا اور میرے آگے ناریلوں اور کیلوں کا ڈھیر لگا دیا۔

میں نے بھوک کو قابو میں رکھتے ہوئے ٹھنڈے دل سے سوچا تو محسوس کیا کہ یہ ہے وہ موقع جو زندگی میں صرف ایک بار آتا ہے۔

میں نے ان سے کہا

'میں تمہاری خدمت کرونگا چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے تم بے چارے (حرامزادو) جانوروں'

[بعد میں جب میں اکیلا ہوتا تھا اور لومڑیوں اور چیتوں سے عام جانوروں کے بارے میں بات چیت ہو رہی ہوتی تھی تو ہم انہیں اسی لقب سے یاد کرتے تھے]۔

تو میں نے کہا 'تم بے چارے جانوروں مجھے تمہاری بھوک پر رونا آتا ہے اور تمہارے بے گپھا اور سر چھپانے کی جگہہ نہ ہونے پر، تمہاری کھالوں میں مردنی ہے اور بال اور پر لگتا ہے گھس چکے ہیں حتیٰ کہ تانبے کی سی سرخ آنکھوں والا ناگ بھی مجھے ایسا لگ رہا ہے باوجود اس کے کہ پرانی کینچلی اتار پھینکنے کا موسم ہے (یہ سب معلومات مجھے لومڑیوں نے پہلے ہی سے فراہم کردی تھیں) اس نے ابھی تک وہی پرانی کینچلی پہن رکھی ہے اور اس میں کتنا دکھی لگ رہا ہے'۔

میں نے نعرہ بلند کیا۔۔۔

'ہر ایک کیلئے جائے پناہ، ہر ایک کیلئے باعزت زندگی'

اور اپنی سونڈ سے اپنی دم کی پھنگی پر آگے ہوئے بالوں کی لڑ اکھاڑ کر (حالانکہ ایسا کرنے میں میری چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو آگئے) کہا 'لو یہ لو اور ان سے اپنے جسم ڈھانپ لو'

اور مجمع نے جوش میں ہر طرح کی آوازیں نکالیں بھیں، چڑر چڑر، چوں چوں اور کچھ سسکیاں بھی"۔

۳

ڈاکٹر جب تیسری سٹنگ Sitting کیلئے آیا کیونکہ اس نے پہلے ہی سے کہہ دیا تھا یہ کام کئی سٹنگز Sittings کا ہے اور دو ایک دانت بھرائی بھی مانگتے ہیں تو بڑے دانتوں والے نے خود ہی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا

"وہ ایک سرا تھا میرے جیون کی جگمگاتی پورنماسی، یہ دوسرا سرا ہے اماوس کی اندھیری رات۔ اور جو میں نہیں تھا مجھے وہ بنا دینے کے بعد اب یہ مجھے مار دینا چاہتے ہیں۔

دانتوں میں درد کیلئے تمہیں یہاں بلانا وہ بھی اس وقت جب موت میرے سر پر ناچ رہی ہے محض اس لئیے ہے کہ پہاڑیوں کے اور ترائی کے دوسرے جنگلوں میں ان

سب کے انصاف اور تکلیف شناسی کی دھاک بیٹھ جائے اور وہاں کے سبزہ خور جانور یہاں پناہ لینے کیلئے آنا شروع کردیں۔ کیونکہ یہاں اِن سب کے کھانے کیلئے اب بچا ہی کیا ہے۔

میں پہلے کسی سے ڈرتا نہیں تھا انہوں نے مجھے بغیر چیتوں، تیندؤں کے حفاظتی دستے کے مہاگپھا سے باہر نکلنا ہی بھلا دیا۔

پہلے میں خود پھل توڑتا تھا درختوں کی چھال اکھیڑتا تھا اور کھانے کیلئے جڑیں کھودتا تھا انہوں نے مہاگپھا کے دوار پر روزانہ اتنے ناریل کیلے اور انناس لا لاکر رکھنے شروع کردیئے کہ اب میں گنّا بھی نہیں چبا سکتا

اور کانٹوں پر چلنے میں مجھے تکلیف ہوتی ہے کیونکہ پہلے میرے راستے میں مارے ہوئے ہرنوں، خرگوشوں کی کھالیں اور موروں کے پنکھ بچھائے جاتے تھے۔

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا میں بھی بھولتا گیا کہ باقی سبزہ خور یعنی چرندے کس طرح گذر بسر کر رہے ہیں کیونکہ مجھے اور میری جیون ساتھی اور میرے بچوں کو بہترین گڑ، شہد، شکرقندیاں، گنّے اور آلو باافراط مل رہے تھے۔

ظاہر ہے وہ سب پھل میں خود تو نہیں کھاتا تھا۔ کیا تم تصور کرسکتے ہو ایک دن میں ایک ہزار انناس اور ایک ہزار کیلے میں اکیلا اور وہ بھی سیلون کا ہاتھی کھا سکتا تھا! میں ہاتھی ہوں یا مہا اور روشال ساگر کی کوئی وھیل۔

اور یہ روزانہ جو بے اندازہ جنگلی مرغیاں، تیتر، بکریاں اور ہرن مارے جاتے تھے کیا انہیں بھی میں ہی کھاتا

تھا جو اب سبزہ خور جانور تک مجھی پر اس کا الزام دھرتے ہیں"۔

جب وہ اپنی کتھا ڈاکٹر کو سنا رہا تھا تو دو ایک بھالو اور بھیڑئیے مختلف پیڑوں کا جائزہ لیتے پھر رہے تھے۔ اور آخرکار انہوں نے ایک ایسے درخت کا انتخاب کیا جو بجائے سیدھا اگنے کے ٹیڑھا آگا ہوا تھا اور وہیں پر کچھ ٹھونکا پیٹی کرنے لگے۔

بڑے دانتوں والے نے کہا "مجھے اس پنلیا کے نیچے رکھا جاتا ہے اور مجھ پر جنگلی کتوں کے غول کی نگاہ رہتی ہے کہ بھاگنے نہ پاؤں۔ وہیں مجھے پخانہ کرنا پڑتا ہے وہیں کھانا پڑتا ہے ـــ سوکھے ہوئے بے رس گنّے اور گھاس ـ

کبھی کبھی میرا خاندان مجھ سے ملنے آتا ہے اور وہ میری حالت پر رونے لگتے ہیں کیونکہ اس ڈھنڈی سہاگنپھا کے بعد یہ دونوں رُخ سے کھلی ہوئی پنلیا ـــ اور میری جیون ساتھی کہتی ہے

'میں نے تم سے شروع ہی میں نہیں کہہ دیا تھا ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاھئیے۔ لیکن سرکس میں دس سال گذارنے کے بعد تم اتنے لائیم لائیٹ Limelight کے عادی ہو گئے تھے کہ یہاں حکومت کرنے کا لطف لیتے رہے جبکہ درحقیقت اس سارے نظام کا تانا بانا تم پر حکومت کررہا تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا یہاں والے غیر مطمئن ہیں ـــ دونوں قسم کے وہ جو گلّوں میں رہ رہے ہیں جیسے ہرن، جنگلی بکریاں اور جنگلی مرغیاں اور وہ جو اکیلے کام کرنے کے عادی ہیں جیسے نیولے۔ سب بے دریغ چیتوں، لومڑیوں اور بھیڑیوں کا شکار ہو رہے ہیں اور جنھیں اکثر بغیر ضرورت کے مارا جاتا ہے۔ لیکن تم چونکہ سب سے اونچے

Scanned by CamScanner

ہو اُن کی نظر تمہاری موجودگی میں لومڑیوں، بھیڑیوں اور چیتوں پر نہیں پڑے گی۔ صرف تم پر پڑے گی کیونکہ سب بھوکے ہیں`۔

لیکن اُن دنوں میں اس کی کہاں سنتا تھا۔

جو کچھ یہاں ہونے والا ہے ہرنوں اور خرگوشوں، موروں اور جل کے پنچھیوں کا سورکھ پن ہے کہ وہ اسے کھیل نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اور آدمی کا بھی ــــ مجھے مارنے کیلئے انہوں نے بھی دور دور سے مشہور شکاری بلا رکھے ہیں کیونکہ دوسرے سبزہ خور جانوروں کیلئے مجھے جنگل سے نکل کر کسانوں کی لگائی ہوئی لوہے کے تاروں کی باڑھ کو توڑنا پڑتا تھا، اگر انہیں سبزہ نہیں ملتا تو ان کی نسلیں ختم ہونے لگتیں اور اگر وہ نہ رہتے تو بھیڑئیے، چیتے اور لکڑ بگھے کیا کھاتے! تو یہ تھی میری افادیت ــــ

اور گھر کی اپنی اس اہمیت کو برقرار رکھنے کیلئے مجھے اپنے جنگل کے ٹکڑے کو چھوڑ کر آس پاس کے جنگلوں اور دیہاتوں میں اپنے جتّھے اور اپنی طاقت کی دہشت برقرار رکھنی ہوتی تھی ــــ یہ میرا بیرونِ جنگل امیج Image تھا کہ کسان مجھ سے کتنے خوف زدہ ہیں اور دوسرے جنگلوں والے مجھے اپنے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو چکانے کیلئے مدعو کرتے ہیں اور اس وقت جب ان کے علاقوں پر کسانوں نے حملہ کیا ہو۔

ایسے موقعوں پر کسانوں کے گھروں پر میرا ریلہ بڑا اہم سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کی لومڑیاں اور بندر میرے اس بین الجنگلاتی امیج کو ابھارتے تھے اور میں تو خیر اپنے یہاں کے عام جانوروں کی زندگی سے کٹ ہی چکا تھا خود وہ مجبور اور محکوم جانور اپنی مشکلات اور تکالیف کو بھول کر

فخر سے کہتے تھے اگنگ اور امنج لدیوں کے بیچ کا یہ بن واقعی اس بن سے کم نہیں ہے جس میں رام، سیتا اور لچھمن کبھی رہے تھے — کیونکہ اس پر مجھ جیسے بلوان کی حکمرانی تھی"۔

بہت سے جانور اس ایک طرف کو لچے ہوئے پیڑ کی طرف برگد کی جٹائیں لئے جارہے تھے۔

ڈاکٹر اپنے بیگ سے نکال کر سینڈوچز کھا رہا تھا اور اس نے ایک سینڈوچ میز پر بڑے دانتوں والے کیلئے بھی رکھ دیا تھا۔ لیکن بڑا دانتوں والا واقعی مغموم تھا اور اسے سینڈوچ میں بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی

"یہ انکا بھولا پن ہے" بڑے دانتوں والے نے دوبارہ قدرے زور سے کہا۔

"کس کا؟" ڈاکٹر نے کام پر واپس آتے ہوئے کہا۔

"ان سادہ لوحوں کا کہ مجھے ماردینے سے یہ تانا بانا، یہ سیٹ آپ، یہ جنگل کا نظام ختم ہوجائیگا۔ اور شہنشاہ سلیمان کا راج لوٹ آئے گا جس میں تمام جانوروں کی دعوت کا روزانہ اہتمام ہوا کرے گا۔

لیکن کون کہہ سکتا ہے پھر سے ایک بڑی مچھلی سمندر سے نکل کر سارے جانوروں کا کھانا ایک ہی لقمے میں صاف نہیں کرجائیگی!"۔

ڈاکٹر نے کہا "عزت مآب پھر وہ دوسری دعوت کا انتظار کرنے لگینگے"۔

بڑے دانتوں والے کی سونڈ میں سے ایک خشک سی ہنسی کی ویسی ہی آواز آئی جیسی موٹے، کھوکھلے بانس میں سے پھونکنے پر آتی ہے۔ پھر سوچ کے ساگر میں ڈبکی لگا کر اس نے کہا

Scanned by CamScanner

"میرے سرکس کے دنوں میں یہ اس شام کی بات ہے جب امریکہ کے صدر کو کسی سر پھرے نے ٹیلیسکوپ لگی ہوئی بندوق سے اڑا دیا تھا۔"

"آپ ٹیلیسکوپ تک سے واقف ہیں؟" ڈاکٹر نے تعجب سے کہا۔

"مجھے شک ہوتا ہے تم ایتھولوجسٹ ہو بھی یا نہیں" بڑے دانتوں والے نے کہا۔ "دانتوں کے ڈاکٹر نہیں ہو یہ فیصلہ تو میں پہلے ہی کرچکا ہوں" — ڈاکٹر ہنسنے لگا — "کہیں ان سب میں تم بھی شریک تو نہیں ہو جسے مجھے روحانی ایذائیں پہنچانے کیلئے یہاں بھیجا گیا ہے؟

ڈاکٹر ٹیلیکسوپ ہی سے ہر ہاتھی پہلی بار پکڑنے کیلئے ڈھونڈھا جاتا ہے اور پھر زندگی بھر ٹیلیسکوپ — دو آنکھوں والی ہی سہی — اسے ایرینا میں ہر رات ہر طرف نظر آتی ہے۔ اسے دیکھنے کیلئے نہیں اس کے دانتوں پر لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھنے کیلئے۔ امید ہے اتنی بات تم بھی سمجھتے ہو گے؟"

ڈاکٹر نے ہنس کر کہا "آپ میں یقیناً مزاح کی حِس ہے اور اس میں جرأت کا امتزاج ہے"۔

"شکریہ" بڑے دانتوں والے نے کہا۔ "سہل زبان میں کہو 'آپ میں مزاح کی حِس ہے اور وہ بھی اس وقت جب موت آپ کے سر پر ناچ رہی ہے'"۔

"سے تھینک یو" سفید طوطے نے کہا۔

بڑے دانتوں والے نے اس پر نظر ڈالی جیسے کہہ رہا ہو 'بس؟ یا اور بھی کچھ کہنا آتا ہے؟'

پھر اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ تو یہ اس شام کی بات ہے۔ اپنا کھیل ختم کرکے میں تماشائیوں سے رنگ کا چکر لگاکر

داد لے رہا تھا۔ اگلی سیٹوں پر بیٹھنے والوں میں سے دو کو کھیل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور تم جانتے ہوگے سرکس میں بالعموم ایسے ہی افراد کو سب سے آگے کوئی مخصوص جگہہ دی جاتی ھے اور بعد میں کہا جانور اور کہا ٹرینز اور آرٹسٹ ھر ایک کو ایسوں ہی کے سامنے سر جھکاکر داد لینی پڑتی ھے۔ بہرحال، ان میں سے ایک جو ڈرتے ڈرتے اپنے ھاتھہ سے میری سونڈ کو تھپ تھپا رہا تھا دوسرے سے بولا

'روس اور امریکہ جو بھی ایک دوسرے کیلئے ہوں یہ کام ایک فرد واحد کا ھو سکتا ھے۔ ایک پڑھی لکھی قوم اور اس کی حکومت کا نہیں۔ خواہ وہ فرد واحد اس کیمپ کا ہو یا اُس کیمپ کا'۔

اس کے ساتھی نے ڈرتے ڈرتے کہا ــ کیونکہ میری سونڈ کو تھپ تھپانے کی اب اس کی باری تھی اور بچے اور عورتیں سی کی طرف اس کارنامے کیلئے دیکھہ رہے تھے ــ

'تو آپ کے خیال میں اس قتل کے پیچھے کسی فلاں قسم کے ملک کا ھاتھہ نہیں ھے؟'

میں ملکوں کی اس قسم کا نام بھول گیا ہوں جو اُس نے لیا تھا اور یوں بھی ملکوں کی اتنی قسمیں ہیں کہ انہیں یاد رکھنا مشکل ھے

'ایک ملک کا ملک اتنا احمق کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ سمجھہ بیٹھے کہ کہیں کے سربراہ مملکت کو ختم کردینے سے وہاں کا نظام بدلا جاسکتا ھے' میں نے اُن سے دور ھوتے ھوئے پہلے کو قدرے جھنجلاہٹ سے کہتے سُنا۔

بچے اور عورتیں زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے پتہ نہیں مجھہ پر یا اُن دونوں کی بہادری پر! تم نے دیکھا

یہ بھولپن یا پاگل پن جو یہاں کے جانوروں پر سوار ہے انسانوں کی دنیا میں بھی اس کی مثالیں میں سُن چکا ہوں۔

تم پڑھ چکے ہوگے۔

مجھے پڑھنا نہیں آتا لیکن لوگوں کے سامنے سونڈ سے پہلے آنکھوں پر بانس کی کمانیوں کی عینک لگاکر آئی لڑکی برتھا کے ہاتھ سے اخبار لیکر مجھے اپنی آنکھوں کے آگے کچھ دیر تک رکھنا پڑتا تھا، جس کا مطلب ہوتا تھا میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔ اور اس پر بھی تالیاں بجتی تھیں۔

ویسے اخبار پڑھنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے" اس نے مسکراہٹ سے کہا۔

"کونسا؟" ڈاکٹر نے بھی اس کے لہجے کو بھانپ کر مسکراتے ہوئے پوچھا

"جس طرح میں نئے ٹرینر کو دھوپ میں آرام کرسی پر دراز ہر صبح اخبار آنکھوں پر رکھے دیکھتا تھا۔ اس طریقے سے پڑھنے میں کاغذ کے نیچے سے خرّاٹوں کی آوازیں بھی نکلتی رہتی ہیں"۔

ڈاکٹر نے کہا "اخبار پڑھنے کا زیادہ صحیح طریقہ وہی ہے"

دوبارہ بڑے دانتوں والا ایک کمزور پھیکی سی ہنسی ہنسا۔

پنّلیا کے پاس اگے ہوئے نیم کی چھاؤں میں لیٹے ہوئے دو چیتے ایک پتھر پر سر رکھے سو رہے تھے اور ایک گلہری اپنے اگلے پنجوں میں املی کا کتارا پکڑے ایک شاخ پر اکڑوں بیٹھی ڈاکٹر اور بڑے دانتوں والے کی گفتگو بڑے غور سے سُن رہی تھی۔

تھوڑے توقف سے بڑے دانتوں والے نے کہا "اور اب

جو باتیں میرے ذہن میں آرہی ہیں انہیں میں نے اُن دونوں کی گفتگو کی اگلی صبح سُنا تھا جب میں مٹی اور گھاس پھوس سوکھے اشنان کیلئے سونڈ سے اٹھا اٹھاکر اپنے جسم پر چھڑک رہا تھا اور میری ساتھی بڑے من پھانسنے والے آسن سے دھوپ میں سو رہی تھی، اپنی خوبصورت، ملائم، نقش و نگار سے مرصع سونڈ اس نے گول گول کرکے اپنے خوبصورت سر کے نیچے تکئیے کی طرح رکھ لی تھی۔ سونے کی یہ ادا اس نے سرکس کی لڑکیوں سے سیکھی تھی جو اپنے خیموں میں سر کے نیچے تکئے رکھ کر سوتی تھیں— اور یہاں آجانے کے بعد بھی یہ ادا اس میں برقرار رہی— بندروں اور لومڑیوں نے چھوٹے جانوروں کے دماغ میں یہ بات بیٹھا دی تھی کہ انکی فرسٹ کاؤ ایلفینٹ یا فرسٹ لیڈی اتنی اعلیٰ نسب اور تربیت یافتہ مذاق کی ہے کہ اسے— اور اس کے ساتھ مجھے بھی— بغیر تکیہ سر کے نیچے رکھے نیند نہیں آتی ہے۔ چنانچہ ہمارے تکیوں کیلئے پانچسو خرگوشوں کو ایک دن میں مارا گیا تھا اور انکی کھالوں کے دو ہموار ڈھیر مہاگپھا میں ایک طرف بنائے گئے تھے۔ اسی طرح گلہریوں کی کھالوں کے ڈھیر ہمارے بچوں کیلئے بنتے گئے۔

جانور بھی عجیب ہوتے ہیں— وہ ہماری اس امارت اور تکبّر سے مرعوب بھی تھے اور کبھی کبھی اس کے خلاف چِلّا بھی اٹھتے تھے۔

روپا مجھے ہمیشہ سوتی ہوئی زیادہ موہنی لگتی تھی. کیونکہ اس وقت اس کا مجھے نصیحت کرنے والا بڑا مُنھ بند ہوتا تھا۔ وہ جنوب مشرقی ایشیا کی رہنے والی ہے اور اکثر فخر سے اپنے کو فرینچ انڈوچائینا کا بتاتی ہے اور سرکس کے دنوں میں اکثر چنگھاڑتی بھی فرانسیسی لہجے میں تھی۔

میں سیلاونی لہجے میں چنگھاڑتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ سماٹرا کی ہے یا تھائی لینڈ کی، لیکن بہت چھوٹی ہے۔ مشکل سے چھ فٹ۔ میں خود سات فٹ کا ہوں، بارہ کا نہیں جیساکہ نظر آرہا ہوں۔ اُف میری ہڈیاں اور میری کھال! لگتا ہے میں اندر سے ٹوٹ رہا ہوں اور کھال پھٹنے والی ہے۔

خیر۔ تو اس صبح وہاں دو گوری رنگت والے آئے جو کسی باہر کے ملک کے لگتے تھے اور جانوروں کی تصویریں لے رہے تھے۔ رنگ ماسٹر سے انہوں نے کہا تھا وہ کسی رسالے کیلئے سرورق کی کہانی 'ھندوستان میں سرکس' کے عنوان سے لکھ رہے تھے۔ جانوروں کے پنجروں کے آس پاس پھرتے ہوئے میں نے ان کو بھی یہی باتیں کرتے سُنا کہ

کسی ملک کے چلانے کی جو مشینری ایک بار بنجاتی ہے ایک طرح سے Unbreakable یعنی اویناش اور اجیت ہوتی ہے۔ جو اس کے پرزے ہوتے ہیں وہی اس کے چلانے والے بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ کوئی گاؤدی ہی سوچ سکتا ہے کہ ایسی مشین کے باہر کے خول یعنی کیبینیٹ Cabinet کو بدل ڈالنے سے وہ ملک بدل جائیگا۔ ویسے ایسی کوشش کی اکثر جاتی ہے۔

ملک جہاں تک میں اسے سمجھ پایا ہوں ایک طرح کا سرکس ہوتا ہے اور اسے چلانے والے ٹرینرز اور رِنگ ماسٹر۔ اور سرکس کی بڑی چھت کے تیز ہوا سے اڑجانے یا اس کے کسی بے ضرر مسخرے یا چند چھوٹے ایکروبیٹس کو چھٹی دے دینے سے یہ نہیں ہوتا ہے کہ جیسے زمین کو گائے نے تھک جانے پر اپنے ایک سینگ سے اٹھاکر دوسرے پر رکھ لیا ہو۔

اور گاؤدی سے میرے ذہن میں خرگوش کی سی عقل

والا انسان آتا ہے جو راستے میں سوئے ہوئے پائیتھن تک کو سونگھ کر دیکھتا ہے اور اگلے ہی لمحے اس کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ تمہاری سمجھ میں میری باتیں آرہی ہیں؟"

"جی" ڈاکٹر نے کہا

"سوائے دو ایک کے انسانوں کی دنیا کے موٹے موٹے لفظ مجھے بھول چکے ہیں جس طرح ملک کی وہ خاص قسم بھول گیا تھا

("میں سمجھ گیا تھا" درمیان میں ڈاکٹر نے کہا)

اکثر ملکوں کے نام مجھے البتہ یاد ہیں کیونکہ وہ سرکس کی دنیا میں دن رات سننے میں آتے ہیں۔۔۔ اس ملک کا سرکس اور اُس ملک کا سرکس، اور ہر سرکس برابر سفر میں رہتا ہے"

ڈاکٹر نے کہا "میں آپ کی ہر بات سمجھ رہا ہوں"

"تھینک یو" بڑے دانتوں والے نے سفید طوطے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "اس پر دوسرے نے کہا تھا کہ اور یہ گاؤدی پن انفرادی فعل ہی نہیں اجتماعی بھی ہوتا ہے مثلاً چند سال پہلے جو فلاں ملک کو چلانے والوں نے کیا تھا

نئے رنیگ ماسٹرز چننے کا وقت تھا اور سب جانوروں کو، میرا مطلب ہے انسانوں کو، اپنی رائے کا اظہار کرنا تھا کہ وہ پرانوں میں سے کس کس کو رکھنا چاہتے ہیں۔ اور کون سے نئے لانا چاہتے ہیں۔ اسی میں کچھ گڑ بڑ ہوئی اور لوگ چلانے لگے دھاندلیاں کی گئی ہیں جس طرح کی دھاندلی ہمارے روٹ پکانے والے اکثر کرجاتے تھے اور ہم بھانپ لیتے تھے کہ اُس نے بیچ میں سے کتنا آٹا مار دیا ہے"

وہ آسمان میں بادلوں کی بنتی بگڑتی تصویروں کو دیکھنے لگا جو نجانے کہاں سے بھٹک کر اِدھر آ نکلے تھے۔

ڈاکٹر اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہا تھا

"تو لوگوں کے چلانے کو تو کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس ملک کے چلانے والے کیسے برداشت کرتے؟ کبھی کوئی رنگ ماسٹر دیکھا ہے جو ذراسی حکم عدولی کو برداشت کرسکتا ہو، یا جو اس نے کرکے دکھانے کو کہا ہے اس میں تاخیر کو؟"

پیڑ پر گلہری ابھی تک ہمہ تن گوش بیٹھی تھی اور کُتے سوتے میں سے کبھی کبھی آنکھ کھول کر ڈاکٹر اور بڑے دانتوں والے کو دیکھ لیتے تھے

"تم نے پوچھا تھا میں ان کے ہتھے کہاں سے چڑھ گیا تھا؟" بڑے دانتوں والے نے جیسے نیند سے چونکتے ہوئے کہا

"جی" ڈاکٹر نے کہا "اور ابھی تک یہ نہیں سمجھ پایا ہوں کہ اس دوشاخے میں وہ سر کس نے رکھا تھا"۔

"ڈاکٹر جو کچھ تم یہاں ہوتے دیکھ رہے ہو اور جو اس جنگل کے حالات ہیں انہیں تمہیں سمجھانے کیلئے ناچار مجھے انسانوں ہی کی دنیا کی مثالیں دینی پڑ رہی ہیں — جو میرے لئے خاصا مشکل کام ہے — اور اسی وجہ سے وہ صبح اور وہ دونوں فوٹوگرافر بار بار میرے ذہن میں آرہے ہیں۔

تمہارے ذہن میں وہ واقعات ہیں جب ایک ملک کے رنگ لیڈر اور اس کے ساتھیوں کو بحیرہ روم سے ملے ہوئے ایک چھوٹے سے سمندر کے ایک چھوٹے سے جزیرے پر کچھ دن قید میں رکھا گیا تھا اور بعد میں انہیں موت کی سزا دی گئی تھی؟"

"جی ہاں ہیں" ڈاکٹر نے کہا
"اس موت کی سزا کے ساتھ ایک ایسی بات وابستہ ہے جس پر مجھے اپنی اس حالت میں بھی ہنسی آرہی ہے۔ میرا خیال ہے وہ سزا دینے والے بھی کسی سرکس کے مسخرے تھے اور ایسے سوانگ بہرحال اگر نہ رچائے جائیں تو لوگ بے مزہ ہوکر منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجانے لگتے ہیں اور سیٹیں ٹوٹنے لگتی ہیں"۔

ڈاکٹر نے کہا "واقعی لوگ 'ہاتھی کی سی یادداشت' کی مثال صحیح دیتے ہیں۔ لیکن وہ بات کیا ہے جس پر آپ کو ہنسی آرہی ہے؟"

بڑے دانتوں والے نے کہا "پھر وہی؟ پوری بات کہو: 'اور وہ بھی اس حالت میں' — لیکن پہلے تم وہ واقعہ مجھے سناؤ"

ڈاکٹر نے کہا "آپ نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا اب مجھے بھی اپنے ذہن کو کریدنا پڑے گا۔

آپ شاید ساٹھ یا اکسٹھ کی بات کر رہے ہیں لیکن تناؤ کی فضا تو وہاں چھ سال پہلے سے تھی جب وہاں عام چناؤ ہوا تھا اور کہا جارہا تھا کہ نتائج میں گڑ بڑ کی گئی ہے — اور یہ بات ایسی ہے جیسے کسی ایسے ملک کا راج برداشت نہیں کرسکتا ہے جہاں تعلیم کا فقدان ہو۔ ایسے ملک کے راج تنقید کے معاملے میں بچوں کی سی خوئے نازک رکھتے ہیں اور ان کے محافظ بگڑے ہوئے بچوں کے ماں باپ کی طرح ان کے پیر پٹخنے اور دیواروں سے سر ٹکرانے اور ان کے بلانے پر فوراً ان کی مدد کو لپکتے ہیں —

وہاں بھی لپکے یا یہ کہ بلائے گئے تھے اور ایک خاص قانون کے ذریعے ان لیکھکوں کو جیل میں ڈال دیا گیا

جو راج کی نیک نیتی پر لوگوں کے دل میں شک پیدا کررہے تھے۔

لوگ کہتے ہیں قانون کا ہاتھ لمبا ہوتا ہے لیکن وہاں راج کے ہاتھ اتنے لمبے ہوگئے تھے کہ عدالتوں تک پہنچنے لگے اور جو راندۂ درگاہ ہوگئے تھے انہیں وقت سے پہلے رٹائر کردیا گیا۔ یہی ان سب کے ساتھ ہوا جو راج کے برداشت کے فقدان کی پالیسی کو برداشت نہیں کرسکتے تھے — اور جنہیں راج برداشت نہیں کرسکتا ہے"۔

"tit for tat" (حساب بیباق) بڑے دانتوں والے نے کہا۔

"گڈ بوئے" اوپر سے سفید طوطے نے کہا

"وزیر اعظم کوزعم تھا ان کے دور میں گیہوں کی پیداوار بڑھی تھی، زیادہ زمین زیر کاشت آئی تھی، دریاؤں پر نئے ڈیم بنے تھے اور کتنے سو یا ہزار کلومیٹر نئی سڑکیں بنی تھیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک کسی کو یہ حق نہیں ہونا چاہئیے تھا۔۔"

بڑے دانتوں والے نے تالی بجانے والے انداز سے اپنا اگلا ایک پاؤں دوسرے پر مارا اور بولا "دیٹس اِٹ — یہی وہ دونوں کہہ رہے تھے

ہر بڑا ٹرینر اسی طرح کہتا ہے 'لوگ سرکس دیکھنے آتے ہیں اور اس سے کوئی بحث نہیں ہونی چاہئیے کہ جو پیش کیا جارہا ہے اسے جانوروں اور کرتب دکھانے والوں کو سکھانے کیلئے کیا طریقے استعمال کئے گئے ہیں'۔ Sorry for the interruption (بیچ میں بولنے کی معافی چاہتاہوں)"

"لیکن لوگ قلت اور گرانی کے خلاف چلّا رہے تھے جس طرح سرکس کی روشنی میں ڈوبے ہوئے ایرنیا کے باہر

Scanned by CamScanner

معمولی تنخواہ پانے والے ملازمین اور آدھا پیٹ خوراک پانے والے جانور بڑبڑاتے یا بلبلاتے ہونگے۔

وہاں کے آسودہ حال زمیندار، کسان مطمئن تھے کیونکہ وزیر اعظم کے راج نے جو قرضے انہیں دے رکھے تھے انکے لوٹانے کی ان کو فکر نہیں تھی اور نہ ہی راج مصلحتاً وہ قرضے ان سے طلب کررہا تھا۔ اس طرح اس کا خیال تھا ایک خاص بااثر طبقہ پیدا ہو رہا تھا جو ہر بُرے وقت میں اس کا ساتھ دے گا۔ اور ہر فرینکو اور پپاڈاک اندر سے اس بُرے وقت سے کانپتا ہے جو وہ جانتا ہے ایک نہ ایک دن آنا ہے"

بڑے دانتوں والے نے پوچھا "وہ دونوں کس سرکس کے رنگ ماسٹر تھے؟"

ڈاکٹر نے محسوس کیا یہ کہتے ہوئے وہ غیر شعوری طور پر جوش میں آگیا تھا۔

"اسپین اور ھیتی کے" اس نے بوتل سے ٹھنڈا پانی انڈیلتے ہوئے کہا

"خود تمہاری یادداشت کسی ھاتھی سے کم نہیں ہے"

ڈاکٹر نے 'تھینک یو' کہا

"گڈ بوئے" اوپر سے سفید طوطے نے کہا

ڈاکٹر ھنس پڑا پھر وہ گلاس کو دوبارہ بھرکر اپنی جگہہ سے اٹھ کھڑا ھوا۔ بڑے دانتوں والے نے اپنا منہہ کھول دیا اور سونڈ اوپر ھوا میں اٹھادی۔ ھاتھی کے منہہ میں پانی انڈیلتے ہوئے اس نے کہا

"لیکن شہری چلا رہے تھے کہ زمینداروں کو دئے ہوئے یہ قرضے ٹریکٹرز کی جگہہ قیمتی سے قیمتی کاریں اور کھاد کی جگہہ اعلیٰ سے اعلیٰ پرفیومز خریدنے کے کام آرہے تھے۔

Scanned by CamScanner

انھیں جب مال کی قیمت سے زیادہ قیمت راج ادا کر رہا تھا تو وہ اور کیا کرتے؟ اور کیوں یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتے کہ کون خالی پیٹ سویا اور کون سردی میں ٹھٹھر رہا ہوگا"

"ظاہر ہے وہ زائد زیرکاشت زمین اور نئی سڑکیں اس کیلئے بے معنی تھیں" بڑے دانتوں والے نے بات کو سمجھ جانے والے انداز سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"شہری درمیانہ طبقہ، جو راج کی ڈر بھاگیہ سے تعلیم سے محروم ہونے سے رہ گیا تھا، راج کی غلط پالیسیوں، غیرضروری اخراجات، بے مقصد اسکیموں، رشوتوں اور عام بے ترتیبی حیات سے غیر مطمئن تھا۔ ان کا کہنا تھا راج نے دیش کی جائے وقوع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ایک بڑی طاقت کے خلاف دوسری بڑی طاقت کے ہاتھ بیچ دیا ہے"۔

بڑے دانتوں والے نے کہا "وہ اتنی سوجھ بوجھ رکھتے تھے؟"

ڈاکٹر نے کہا "عزت مآب، یوں کہنا چاہئیے وہ بیسویں صدی میں ملکوں کے اس رواج کے خلاف تھے کہ دیش کی اپنی پرجا کو بھلا کر اسے بڑی طاقتوں میں سے آج اِس کے اور کل اُس کے ہاتھ گروی رکھ کر جو رقم ملے اس سے راج کے بڑے بڑے کارندے اپنی ضرورتیں پوری کریں اور اپنا امیج Image — جیسے کہ آپ اپنا بتا رہے تھے — دیش میں اور باہر کی دنیا میں بنائیں۔ لیکن مشکل یہ تھی راج انھیں پچھلی بینچوں پر بیٹھ کر شور مچانے والے طالبعلموں سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ بلکہ اس سے بھی بدتر کوئی گروپ — جیب کتروں، ٹھگوں یا دیش ورودھیوں کا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ راج نے آئین میں اپنی ضرورت کے لحاظ سے تبدیلیاں کی تھیں لیکن شور مچانے والوں کے لیڈر

کے تقریری ٹوئر پر ـــ جیسا کہ آج کل ہر کم پڑھے لکھے دیش میں رواج ہے ـــ پابندی عائد کردی گئی اور ایک آدمی کا حکم جس پر ہر قسم کی مخالفت اور نکتہ چینی کی قانوناً ممانعت ہو نافض کر دیا گیا اور یقیناً اس کیلئے ان افراد کی ضرورت ہوئی ہوگی جن کے ہاتھوں میں ہتھیار ہوں اور جن کا پیشہ لڑنا مرنا ہو۔ ان سینکوں کو حکم تھا کہ ہر بلبلاتے چلاتے منہ کو خاموش کر دو۔ طلبہ نے جلوس نکالے اور ان میں سے کچھ مارے بھی گئے ـ یہ سب بیسویں صدی کی راج نیتی کی رسومات ہیں اور طلبہ ہوتے ہی مارے جانے کیلئے ہیں ـــ غلط قسم کے طالبعلموں کے ہاتھوں یا انقلاب لاتے ہوئے"۔

بڑا دانتوں والا املی کے پتے اس طرح چبا رہا تھا جیسے پان کھا رہا ہو۔ سفید طوطا اڑ کر ڈاکٹر کی ٹھنڈے پانی کی بوتل کے ڈھکنے پر بیٹھ گیا۔

"سوری" (Sorry) ڈاکٹر نے کہا "مجھے نہیں معلوم تھا تم بھی پیاسے ہو"

پھر اس نے گلاس میں طوطے کیلئے تھوڑا پانی انڈیل دیا جسے وہ ٹھہر ٹھہر کر پیتا رہا۔

"اس کے بعد مئی میں ایک رات فوج نے صدر، وزیراعظم اور باقی راج کو گرفتار کرلیا ـــ یہ بھی آج کل کا رواج ہے۔ اس میں کوئی بات نئی نہیں تھی"۔

بڑے دانتوں والے نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا "مئی کی ایک رات؟ یعنی بیساکھ، جیٹھ کی گرمی میں! ایئر کنڈیشنڈ کمروں کے بعد ایکا ایکی جیل میں ـ بیچاروں پر بڑی بیتی ہوگی"

"اتنی بڑی نہیں، جتنی یہاں بیتتی ـ بحیرہ روم کی آب و ہوا نرم دل ہے" ڈاکٹر نے کہا

بڑے دانتوں والے نے کہا "میں بھول گیا تھا۔ مئی میں تو میں خود اٹلی میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکا ہوں۔ قطعاً بُری نہیں ہے"۔

"اس کے بعد جو ہوا وہ آپ کے علم میں ہے۔ نئے سیناپتی نے ان پچھلے راج نیتاؤں کو اس جزیرے پر بھیجدیا کہ اپنے ٹرائیل کا انتظار کریں اور ستمبر ۱۹۶۱ میں اسپیشل کورٹ نے تین افراد کو سزائے موت سُنادی جو فوراً ہی دے بھی دی گئی۔ اس میں وزیر اعظم بھی شامل تھے اور جس کی توقع تھی وہی ہوا جنتا کی یادداشت کمزور ہوتی ہے اور چونکہ نئے راج کے ھنی مون کے دور کی خوشیاں بہت جلد ختم ہو جاتی ہیں اس لئیے دوبارہ جنتا خود کو نراشا اور دکھوں میں گھرا ہوا پاتی ہے اور ہر بار گذرا ہوا راجیہ اسے یاد آتا ہے۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔

لیکن سمجھدار لوگ جب بھی کہتے تھے 'کیا اس اکھاڑ پچھاڑ سے راج کا ڈھانچہ بدل گیا ہے یا وہ اس بڑی طاقت کے چنگل سے نکل گیا ہے۔ ڈکٹیٹر کو ڈکٹیٹر بنانے والے اسی طرح اپنی جگہوں پر موجود ہیں۔ نئے آنے والوں کو اُنہی پرانے راستوں پر چلانے کیلئے مستعد"۔

بڑے دانتوں والے نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ایک پھیکی سی ہنسی ہنسی اور ڈاکٹر سے بولا "تمہارا خیال ہے واقعی ان تین افراد کے ٹرائیل میں آئین میں تبدیلی اور عملے کی بدعنوانیوں، عام مظالم اور جنتاکو تنگ کرتے رہنے کے چارجیز انکے خلاف موت کی سزا سُنانے کیلئے کافی ثابت ہوئے تھے؟"

اس نے سونڈ سے اپنے سرکو فخریہ تھپتھپاتے ہوئے کہا "اس ڈرامے کا کلائمیکس یا سرکس کے آخر میں دکھائی

جانے والی ھوا میں زمین سے بہت اوپر کی دوہری قلابازی یہاں محفوظ ہے۔ تم اسے بھول چکے ھو —

دیش کے اس رنگ لیڈر کو ایک پالتو کتّا رشوت میں لینے پر موت کی سزا سنائی گئی تھی!

ھا ھا ایک پالتو کتا" وہ تمخسر سے ھنسا۔ "زیادہ سے زیادہ وہ اتنا ہی قیمتی ہوگا جتنا سرکس کا قیمتی سے قیمتی کتا ھوسکتا ہے۔ ورنہ عام کتوں کو رشوت کے طور پر کون دیتا ہے —"

"اور کون لیتا ہے؟" ڈاکٹر نے جملہ پورا کیا۔

"لیکن جب روپا اس صبح سو رہی تھی اور دونوں فوٹوگرافر اس کی تصویریں مختلف زاویوں سے لے رہے تھے اور سفید گھوڑے دھوپ میں خاموش کھڑے تھے تو انکی یہ بات کہ ایک کتے کو رشوت میں لے لینے پر وہاں کے رنگ لیڈر کو گولی ماردی گئی ہے ان دونوں کیلئے بھی معمہ تھی اور میرے لئے بھی"۔

ڈاکٹر نے کہا "کتا قیمتی تھا یا نہیں اس سے ان لوگوں کو حقیقت میں بحث نہیں تھی کیونکہ رشوتیں اگر جانوروں کو پیمانہ بناکر ناپی جاسکتیں تو وھاں کا پورا راج رشوت کے گینڈے، ھاتھی اور وھیلیں نگل چکا تھا"۔

"میرا خیال ہے ہر جگہہ وہ جنگل ھو یا آدمیوں کی دنیا یہ مصنوعی باہر کے دانت اس طرح جڑے جاتے ہیں کہ آن سے یا مرکر چھٹکارہ ھونا ہے یا مارے جانے پر — اور یوں بھی ہے جس کے ایک بار لگ جاتے ہیں وہ خود آن سے جدا ہونا نہیں چاہتا ہے — اور جب چاہتا ہے تو اس کام کے کرنے کا وقت گذر چکا ہوتا ہے" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر نے کہا "مجھے افسوس ہے میری باتوں سے آپ کے غم میں بجائے کمی ہونے کے اضافہ ہوگیا"۔

بڑے دانتوں والے نے کہا "نہیں۔ اُس پلیا کے نیچے دن رات خاموش کھڑا رہنے سے مجھے لگنے لگا تھا میرا دماغ پھٹنے والا ہے۔ خیالات مجھے پل بھر کو نہیں چھوڑتے تھے، سوتے میں بھی میرا دماغ جاگتا تھا۔ تم سے باتیں کرکے، اپنے آخری دنوں ہی میں سہی، میں خود کو بہتر طور سے سمجھ پایا ہوں۔

کل شاید سانس لیتی ہوئی دنیا میں مجھے لگتا ہے میرا آخری دن ہوگا۔ تب ہی میرے ساتھ یہ رعایت برتی جارہی ہے کہ آج کوئی اس کا منتظر نہیں ہے کہ کب تمہاری وزٹ ختم ہو اور مجھے اس پلیا کے نیچے لے جاکر کھڑا کردیا جائے۔ اُن لکڑبگھوں (Hyaenas)، بھیڑیوں، لومڑیوں اور چیتوں کو دیکھو ـــ سب کیسے سکون سے بیٹھے ہیں ـــ یہ ان کی کتنی بڑی مہربانی ہے کہ مجھے جتنا وقت میں تمہارے ساتھ گذارنا چاہوں گذارنے دے رہے ہیں۔ بعد میں کوئی نہیں کہہ سکے گا میرے آخری لمحات تک جب میں ہاتھیوں کے راجہ ائیراوت کے درجے سے گرکر ایک عام قیدی بن چکا تھا یہ میرے ساتھ رحم دلی سے پیش نہیں آئے"

کچھ بندر خشک، بے رس کے گنّوں کا ایک گٹّھا لیکر آئے اور انہیں بڑے دانتوں والے کے سامنے ڈال کر چلے گئے۔

اس نے گنّوں پر ایک نظر ڈالی اور رندھے ہوئے گلے سے کہا "ہوں، تو جب تک سانس رہتی ہے کھاتے بھی رہنا پڑتا ہے"۔ پھر اس نے غمزدہ مسکراہٹ سے کہا "بہرحال میرا حلق تو خشک ہورہا ہے۔ آپ شوق فرمائینگے؟"

Scanned by CamScanner

سفید طوطا اور ڈاکٹر دونوں خاموش تھے اور ان سوکھے ہوئے گنوں کو بھوکوں کی طرح چباتے ہوئے بڑے دانتوں والا شرمندہ سا نظر آتا تھا۔ چند گنوں کے بعد اس نے کسی قدر بہتر آواز میں کہا

"اب میں سوچتاہوں زندگی کے اس لمبے سفر میں بہی غلطیاں مجھ سے بھی ہوتی ہیں۔ میں بھی تمہارے پپا ڈاک کی طرح اندر سے ڈرتا رہا ہوں۔ دوشاخے میں رکھا ہوا وہ سر میں اس زمانے میں بھی خواب میں دیکھتا تھا جب میرے راستے میں موروں کے پر اور پھولوں کی پتیاں بچھائی جاتی تھیں — اور بعد میں بھی جب میں نے جنگل میں امن کی بحالی کے نام پر بھیڑیوں اور چیتوں کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ ہر شور مچاتی ہوئی جنگلی مرغی اور ہر مور اور ہر گلہری کا خاتمہ کردیں جن کی آنکھیں ٹیلیسکوپ ہیں اور جن کا کام درختوں پر بیٹھ کر خرگوشوں، باڑھوں، چکاروں کو بھڑکانا تھا کہ ہم پورے جنگل کو دیکھ سکتے ہیں اور یہ کہ میں اور میرے ساتھی کس وقت کیا کررہے تھے۔ اور کس طرح دور بے وجہ مارے ہوئے خرگوشوں کی لاشیں دھوپ میں سڑ رہی تھیں اور ان کے بچے بھوک سے بلبلا کر بلوں سے باہر نکل آئے تھے جس کیلئے شکرے، چیلیں اور گدھ میرے اور میرے ساتھیوں کے شکرگذار تھے—"

"اور ہونا چاہئیے بھی تھا" ڈاکٹر بیچ میں بول پڑا "خرگوشوں کے نوزائیدہ، بے بالوں کے بچّے ان کیلئے واقعی (Delicacy) ڈیلی کیسی ہوتے ہونگے"۔

"وہ کیا؟" بڑے دانتوں والے نے پوچھا

"جیسے ہماری دنیا میں کسی خاتون کو بھیڑ کا غیر زائیدہ بچہ کھانے کا شوق ہو"۔

"وہ کیسے ممکن ہے؟" بڑے دانتوں والے نے تعجب سے پوچھا۔

Scanned by CamScanner

"بھیڑ کا پیٹ چاک کر کے" ڈاکٹر نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"اوغ" بڑے دانتوں والے کو جیسے الٹی کا پھندا لگا ہو۔ پھر اس نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا "لیکن جنگل میں اس تمام بے چینی کے ذمّے دار مجھے یہی گاھریاں اور مور نظر آرہے تھے۔۔۔"

"جو اپنی بولی سے معصوم جانوروں کو آگاہ کردیتے ہیں کہ ہوشیار ہوجاؤ، اس وقت کوئی شیر یا چیتا شکار کی تلاش میں ہے۔ اور جن کا بولنا اگر اس طرف کچھ شکاری بندوقیں لیکر آجاتے تو آپ کی اور آپ کے مختصر سے خاندان کی زندگی بچا سکتا تھا۔ آپ نے انہی کے بولنے پر پابندی لگادی!" ڈاکٹر نے کہا۔

"میرا خیال ہے ان درندوں میں رہتے رہتے میرا دماغ اُن مگرمچھوں کے دماغ سے بھی چھوٹا ہو گیا تھا جو اپنے دانتوں میں پھنسے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کو چُننے والے پرندوں کیلئے مُنھ کُھلا رکھتے ہیں، انہیں اپنا دشمن، مُنھ کا چور یا آسان شکار سمجھ کر جبڑے بند کرکے ہڑپ نہیں کرجاتے" بڑے دانتوں والے نے کہا

"اگر وہ ایسا کرنے لگیں تو ان کے مُنھ میں تعفّن پھیل جائے" ڈاکٹرنے کہا

۴

تھوڑی دیر خاموشی رہی کیونکہ اب ڈاکٹر کا سر

بڑے دانتوں والے کے منھ کے اندر تھا اور وہ اس کی اندر کی داڑھوں میں کوئی پیسٹ بھر رہا تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر کو بڑے دانتوں والے کے دہان میں گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

جب اس نے سر باہر نکالا تو دیکھا جانوروں نے اس ٹھوڑے درخت کی اوپر کی شاخوں سے دو جٹائیں باندھ دی تھیں۔ ڈاکٹر کو خیال ہوا وہ شاید اسی طرح بڑے دانتوں والے کو موت کی سزا دینگے جس طرح بڑے ہاتھی کو ممکن ہے دی گئی ہو اور پھر دوشاخے میں سر رکھنے کا وہ معمہ حل ہوجائے گا۔

لیکن خود بڑے دانتوں والے کو ان تمام کارروائیوں میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ڈاکٹر ایک جانور چاہے وہ ہاتھی ہی کیوں نہ ہو اس کتے کو اکیلا مار سکتا تھا جو زمیندار کے کھیتوں کے گرد لگی ہوئی خاردار باڑھ کے دروازے پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا؟ — اور پوری فصل کا اس نے ستیاناس بھی کیا ہو اور تمام کسانوں کو جانوروں کے اتنا خلاف اس اکیلے نے کردیا ہو کہ انھوں نے جنگل میں جگہ جگہ آگ لگادی جس سے تمام چھوٹے جانور بھاگنے شروع ہو گئے۔

نہیں۔ ایک پالتو ہاتھی کو ایک بدمزاج افریقی ہاتھی بنانے کیلئے بہت سوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا مطلق العنان وحشی ہاتھی جو کسانوں سے بدلہ لینے پر اتر آئے اور اس کے جلو میں حملہ کرنے کیلئے لومڑیوں، گیدڑوں اور بھیڑیوں اور تیندؤں کی ایک پوری فوج ہو۔

میرا تو محض وہ پیر تھا جو اس بے چارے کتے پر پڑگیا تھا جس کے نیچے وہ کچلا گیا۔۔

اس کے بعد تکالیف ہی تکالیف شروع ہوگئیں۔ جانوروں کے حصے میں صرف خشک تالاب رہ گئے۔ کسانوں نے پانی والے تالابوں اور دونوں دریاؤں کے کناروں کی ناکہ بندی کردی ہے نمک چاٹنے کی پہاڑیوں پر انسانوں نے قبضہ کرلیا۔ سبزہ خور جانوروں نے وہاں سے ہجرت شروع کردی، وہ ہر جگہ خوش آمدید تھے۔ لیکن ان چیر پھاڑ والوں کیلئے کس جنگل میں جگہ تھی!

مجھے بنایا اور بگاڑا لومڑیوں، بھیڑیوں اور چیتوں نے، وہ بے ضرورت جانوروں کو مار رہے تھے۔ جتنا ان کے پیٹ میں سما نہیں سکتا تھا اس سے زیادہ وہ شکار کر رہے تھے بالخصوص لومڑیوں کی کپھاؤں کے دوار پر مرے ہوئے خرگوشوں، جنگلی مرغیوں، تیتروں اور کبھی کبھی تو مری ہوئی نیل گایوں تک کے ڈھیر لگے رہتے تھے جو انھیں بھیڑئیے بطور سوغات دیتے ہونگے۔ یا خود بڑے چرندے چھوٹے چرندوں کو رشوت کے طور پر وہاں ڈال جاتے ہونگے۔ ہر لومڑی کے دوار پر ایک گیدڑ بطور دوار پال بیٹھا ہوتا تھا۔ اور اس سب کیلئے مجھے الزام دیا جارہا ہے۔ ان کا کہنا ہے مجھے مارکر باقی سب جانور سکون کی زندگی گذارنے لگیں گے۔

بڑے دانتوں والا ہنسا

ڈاکٹر نے پوچھا "کس بات پر ہنس رہے ہیں؟"

بڑے دانتوں والے نے کہا۔۔۔

"کچھ نہیں مجھے ایک کرسمس کارڈ یاد آگیا جو اس لڑکی برتھا کو کسی (Nun) نن نے بھیجا تھا تاکہ وہ بھی سرکس کی زندگی چھوڑ کر خدا کی حکومت میں داخل ہوجائے۔ اس میں دکھایا گیا تھا ایک ہی جگہ پر ایک آدمی جس کے پیشاب کی جگہ پر شہتوت کا پتہ بندھا ہے، ایک

بھالو، ایک گائے، ایک شیر، ایک سانپ، ایک ہاتھی، ایک ہرن سب جیسے اچنت بیٹھے ہیں — مجھے اس تصویر پر اکثر ہنسی آجاتی ہے۔ ویسی ہی سلطنت کا یہ سب بھولے بھالے جانور خواب دیکھ رہے ہیں۔

کیا میں نے ایک ایک دن میں پانچ سو خرگوش اور دو سو ہرن مارے تھے!

لیکن وہ بدمعاش جنگلی سوّر! اس پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا، جتنی تباہی وہ مچاتا ہے۔ کیونکہ اس کا مزاج خراب ہے اور تہذیب تمیز اسے چھوکر بھی نہیں گئی ہیں، کیونکہ اس کی (Tusks) کانپیں تمہارے جراحی کے چاقو کی طرح دو طرفہ دھار دار ہیں — اور میرے دانت گول ہیں صرف درختوں کی جڑیں کھودنے کے قابل یا یہ کہ کوئی لڑکی ان پر لیٹ جائے۔ میں ایک جینٹل ہاتھی ہوں اور وہ اس کھادر کا غنڈہ ہے جو قبروں سے لاشیں اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اور شمشان سے ادھ جلی لاشیں بھی چراکر بھاگ جاتا ہے۔ وہ گاؤں میں داخل ہوتا ہے تو لوگ گھروں کے دروازے بند کرلیتے ہیں اور گاؤں کی بے دیوار کی مسجدوں میں بھی وہ رات کو گندگی پھیلا آتا ہے۔ وہ فصلیں اجاڑتا ہے اور حملہ بغیر کسی وجہ کے کرتا ہے۔ تمہارا خیال ہے چیتے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو انسانوں اور چھوٹے معصوم جانوروں کا عتاب کیوں سب پر نازل ہوتا، آج کو اتنے سوّر یہاں کیسے ہوتے اور اتنی خون خوار لومڑیاں یہاں کیسے جمع ہوجاتیں!

ان کا کہنا ہے مجھے ماردینا ضروری ہے اور جس رات جب پورنماسی تھی اور کھلے آسمان کے نیچے گیدڑ اور لومڑیاں اور چیتے اور بھیڑئیے سب جمع ہوئے اور مجھے ماردینے کا فیصلہ کیا گیا تو کچھ چھوٹے جانوروں نے جن میں

بندر، سیمھی مینڈک اور کچھوے اور خرگوش بھی شامل تھے
اس موقع کو متشکرانہ انداز سے منایا اور کمرخوں، املی، بیر،
بیل، کیتھے، کٹھل، بڑھل، مونگ پھلیوں اور حتی کہ خربوزوں
تک کی بارش کرکے آسے منایا۔

ان بے چاروں کو یہ نہیں معلوم میرے چلے جانے سے
لومڑیاں بھیڑئیے اور گیدڑ اور گدھ نہیں بدل جائینگے اور
نہ ھی وہ سوٗر۔

میں نے آس کتّے کو نہیں مارا تھا وہ جنٹا (Junta)
کو برسراقتدار رکھنے کی اسکیم کی ایک کڑی تھی کیونکہ
اطراف کے کسان ہم سے تنگ آچکے تھے اور ھمیں ختم
کرنے کیلئے تیار ھوگئے تھے۔ راتوں کو وہ آگ اور الاؤ
جلتے رکھتے تھے اور ھماری گپھاؤں میں دھواں چھوڑتے تھے۔
مجھے اعتراف ہے میں بھی طاقت کے نشے میں تھا اور خودکو
اُیراوت سمجھتا تھا اور بجائے اس کے کہ ان کی تکالیف کی طرف
دھیان دیتا انھیں اپنا دشمن سمجھنے لگا۔ اُسی زمانے میں
کسان اپنے اپنے کھیتوں کے اطراف میں خندقیں کھود رہے
تھے، خاردار تار لگا رہے تھے، ٹانگیں پکڑلینے والے ٹریپس
(Traps) انھوں نے جگہہ جگہہ لگانے شروع کردئیے تھے۔ تو
ظاہر ہے چھوٹے جانوروں کا عرصۂ حیات تنگ ہوگیا تھا جن میں
مور بھی تھے چیتل اور سانبھر بھی جو بھوکے سوتے تھے اور وہ
اس پورے تانے بانے، سیٹ آپ Set-up، سے بیزار ھو چکے تھے۔
میں لیڈر نہیں تھا۔ دریا پار کرنے میں ہم میں جو سب سے بوڑھی
ھتھنی ہوتی ہے وہ آگے آگے چلتی ہے ہم تو پیچھے سے ھونے والے
حملے کو روکنے والوں میں سے ھوتے ہیں۔ تو میں کیسے آس
ناخوشگوار واقعے کیلئے ذمہ دار ٹھیرایا جاسکتا ھوں!

سارا Set-up سیٹ آپ آبادی کے تناسب کو متزلزل
کر رہا تھا ـــ کوئی سبزہ نہیں تو کوئی چرندہ نہیں، اور
کوئی جانور گوشت خوروں کیلئے نہیں۔ اس لئے چرندوں

اور کسانوں کو خاموش کرنے کیلئے سارا پلاٹ بنایا گیا تھا۔ ھوسکتا ہے میں نے اس پر صاد کیا ھو۔

"O.K., Kill that dog guarding the gate"

(ٹھیک ہے اس دوار پال کتّے کو مار دو)

لیکن مجھے یہ یاد نہیں ہے۔

ایسے آرڈر اور گوشت خوروں کیلئے اور انکے حالی موالی اور اہل و عیال کیلئے مراعات کے احکامات یہ تو روز مرہ کے معمول تھے اور دس سال میں یہ مجھے کیسے یاد رہ سکتا ہے کتنے ایسے آرڈر مجھ سے دلوائے گئے!

اور میں تسلیم کرتا ہوں کتنے خود میں نے اپنی مرضی سے دئیے ھونگے۔

لیکن کیا اس فیصلے سے اگنگ اور امنج کے بیچ کے کھادر کے مسائل حل ھوجائینگے؟

انہوں نے مجھے بے اندازہ روحانی اذیتیں پہنچائی ہیں۔ انہوں نے میرا شجرۂ نسب Tapir (تیپر) سے جا ملایا جس کی محض تھوڑی سی لمبی ناک ھوتی ہے اور جو بڑے سورٔ جتنا ھوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ درحقیقت میں ایک برمی ھتھنی کا بیٹا ھوں جس کا کوئی مخصوص نر ساتھی نہیں تھا اور جس نے ایک پوربی افریقہ کے ھاتھی سے میل کیا تھا اور اسی وجہہ سے میرے کان بڑے ھیں کنڈ میں پانی کی سطح پر تیرنے والے پنکج کے پتوں کی طرح کے، اور پیٹھ ھندوستانی ھاتھیوں جیسی ہے کیونکہ ھندوستان بہرحال مشرقی افریقہ اور برما کے بیچ میں ہے۔

میرے شجرۂ نسب کا ان کے مسائل سے کیا تعلق ہے!

لیکن میرے مخالفین نے جو اب کسی گوشت خور کو ھی اپنا لیڈر بنانا چاھتے تھے اس نکتے کو خوب اچھالا — انہوں نے اس وقت میرے شجرۂ نسب کے بارے میں کوئی سوال نہیں

کیا تھا جب میں اُس کٹے ہوئے سر کو درخت کے دوشاخے میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔

اب جو میری جگہ لائے جارہے ہیں وہ بھی میری ہی طرح لیڈری کی تربیت سے محروم ہیں اور ہر ایک خواہ وہ جانوں اور فصلوں کے تحفظ اور انسانوں اور مختلف قسم کے جانوروں کے آپس میں میل جل کر رہنے کے بنیادی اصولوں سے بھی واقف نہ ہو رات بھر میں بادشاہ بنجانے کا خواب دیکھ رہا ہے اور غالباً سور کو فصلوں کے بارے میں انسان اور جانوروں کے باھمی تعاون کا عہدہ سپرد کیا جائے گا۔ میں نے سرکس کے دنوں میں سُنا تھا پڑھے لکھے ملکوں میں معاشیات کا لیڈر معاشیات کا ڈاکٹر اور کاشت کا لیڈر کاشت کا ڈاکٹر ہوتا ہے اور سالوں کام کرنے کے بعد اُس عہدے پر پہنچنے کے بارے میں سوچتا ہے۔

لیکن ڈاکٹر تم کس قسم کے ڈاکٹر ہو اور میرے کیس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

ڈاکٹر نے تھیلا اٹھاتے ہوئے کہا

"میری آپ کے کیس کے بارے میں کیا رائے ہوگی! خود انسانوں کی عدالت میں میری رائے کی کوئی خاص وقعت نہیں ہے چہ جائیکہ میں ایتھولوجسٹ ہونے کے ناتے سے آپ کی حمایت میں جانوروں کی کاؤنسل میں کچھ کہوں"۔

"کیوں؟" بڑے دانتوں والے نے پوچھا

"اس لئیے کہ میں اور قانون داں دو مخالف سمتوں سے ایک کیس کا یا ایک مجرم کا تجزیہ کرتے ہیں وہ ایک آدمی کی روح کو توڑ دیتے ہیں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ اقبال جرم ان کے گرج کر بولنے اور ان کی فصاحت سے مرعوب ہو کر کرلے، چاہے

وہ جرم اُس نے کیا ہو یا نہیں۔ ان کا طریقۂ کار مجرم میں خوف پیدا کرنا ہے"

"اور تمہارا؟"

"میرا؟ مجرم کو اعتماد کی اُس دہلیز پر لے آنا ہے — اور یہ جب ہی ممکن ہے جب دو آدمی جنہیں ایک دوسرے پر اعتماد ہو جن میں ایک دوسرے سے دلچسپی ہو — کہ اگر اُس نے واقعی وہ جرم کیا ہے تو اس کی انسانیت یا جانوریت میرے تعاون سے اتنی جاگ اٹھے کہ وہ خود محسوس کرنے لگے 'جو پھندہ میری گردن میں پڑنا چاہیے تھا کسی دوسرے کی گردن میں تو نہیں پڑ رہا ہے'۔

میں موت کے خوف پر غالب آنے میں اس کی مدد کرتا ہوں اور چاہتا ہوں وہ جرم کے بوجھ کو اپنی چھاتی سے اتار پھینکے — میرے طریقۂ کار میں واپسی کی راہیں کھلی ہیں۔ دوسرے طریقۂ کار میں واپسی کا راستہ بند ہے۔ مجرم جس راہ پر بھیجدیا جاتا ہے وہاں سے واپس لوٹ کر نہیں آ سکتا ہے۔ اور اگر کچھ نہ بھی ہو تو بھی اس طریقۂ کار میں ایک پورے خاندان کی عزت لمحے بھر میں مٹی میں مل سکتی ہے کیونکہ انٹرویو (یا مقدمہ) برسرعام ہوتا ہے۔ میرے طریقۂ کار میں ان کے لئیے رسوائی نہیں ہے پردہ پوشی ہے۔

مثلاً کسی باعزت آدمی پر ایک کم عمر لڑکی پر مجرمانہ حملہ کرنے کا الزام جو اس کے خلاف ایک سازش ہوسکتی ہے لیکن اگر وہ آدمی باعزت طور سے بری بھی ہوجائے تو بھی اس کے خاندان کی ساکھ ہمیشہ کیلئے ختم ہوجاتی ہے اور اس کے گھر میں ٹوٹی ہوئی آتمائیں رہ جاتی ہیں اور جیون بھر کی کڑھن حتیٰ کہ اس کی بیوی اور بچے بھی ایک موقع پر اُس پر شبہہ کرنے لگتے ہیں کہ کہیں واقعی اس معمر باعزت آدمی نے اس کم عمر لڑکی پر مجرمانہ

حملہ تو نہیں کیا تھا۔ اوز خود باہر جاتے ہوئے لوگوں کی نظروں سے کتراتے ہیں۔ اگر ایسے میں وہ معمر شخص خودکشی کر بیٹھے تو آسے حرام موت کہا جائے گا۔

لیکن میرا خیال ہے عزت مآب، اُبراوت، آپ خود اپنے کیس کی پیروی مجھ سے کہیں بہتر طور سے کرچکے ہیں اور اس کیلئے آپ نے جنگل کے قوانین سے زیادہ منش جاتی کے اتھہاس سے نظیریں پیش کی ہیں جو ظاہر ہے فیصلہ کرنے والوں کی سمجھ سے باہر ہونگی"۔

بڑے دانتوں والا جو کچھ دیر سے خالی الذہن تھا ایک دم چونکا اور بولا "کیا کس کی سمجھ سے باہر ہوگا؟"

ڈاکٹر نے تھیلہ بند کرتے ہوئے کہا "میں کہہ رہا تھا آپ بھینس کے آگے بین بجاتے رہے ہیں"

بڑے دانتوں والے نے مسخرے پن سے کہا "کاش مجھے وہ ٹرینر Trainer بھینس کے آگے بین بجانا ہی سکھا دیتا تو سرکس میں پہلی بار یہ سیکوئینس Sequence بھی دیکھنے میں آتا کہ میں منہ میں بین پکڑے سونڈ کی انگلی تیزی سے اس کے سوراخوں پر چلا رہا ہوں اور ایک بھینس میرے سامنے بے جنبش کھڑی جگالی کر رہی ہے اور دور کہیں سے ایک کالا ناگ رینگتا ہوا آتا ہے جسے دیکھ کر عورتیں اپنی ٹانگیں سیٹوں پر اٹھالیتی ہیں اور وہ میرے ساز پر باوجود کان نہ ہونے کے جھوم رہا ہے اور وہ کانوں والی ہوتے ہوئے بھی خاموش کھڑی ہے"

ڈاکٹر نے بڑے دانتوں والے کی سونڈ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "عزت مآب میں دیکھتا ہوں باوجود دانتوں کی تکلیف کے مزاح کی حس آپ میں ابھی بھی بیدار ہے"

Scanned by CamScanner

"آ ریوا (Au revoir) ڈاکٹر جانداروں کے پاس مزاح کی حس ہی تو ایک چیز ہے جو اگر وہ چاہیں تو موت کی منزل تک ان کا ساتھ دے سکتی ہے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو سرکس کی زندگی میرے لئے بہتر تھی وہاں اُن لوگوں کی باتیں سننے کو ملتی تھیں جو زندگی کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ حالانکہ وہاں میں ایک طرح کا غلام تھا۔

لیکن یہاں باوجود اس کے کہ میں نے حکمرانی کی ہے گھرا درندوں اور مکاروں میں رہا ہوں جنھوں نے مجھے نہ ان معصوم بھولے بھالے جانوروں کا صحیح حال کبھی بتایا نہ مجھے اُن سے ملنے دیا۔

حتیٰ کہ بندر تک سے میں اپنی طاقت کے نشے میں زیادہ نہیں مل سکا جس کی عقل کا پورا جنگل مدّاح ہے ورنہ ــــ"

ڈاکٹر بیچ میں بول اٹھا "خیر یہ اچھا ہی ہوا کہ اس پر آپ نے بھروسہ نہیں کیا ــــ وہ وقت کا ساتھی ہے۔ آپ کے بعد بھی وہ گھاٹے میں نہیں رہے گا۔ نئے بڑے دانتوں والے کا ــــ خدا وہ دن نہ لائے ــــ وہ دور ہی دور سے مشیر بھی ہوگا اور مخبر بھی۔ اور جس طرح آج آپ کے دشمنوں کا ساتھی ہے اسی طرح کل نئے آنے والے کے شروع میں دوست اور بعد میں دشمنوں کا بھی ساتھی ہوگا۔ اس جیسے بغیر داؤں لگائے ہمیشہ ہر بازی جیتتے ہیں"۔

اندر سے ڈاکٹر کو محسوس ہو رہا تھا یہ غالباً ہاتھی کے ساتھ اس کی آخری sitting تھی لیکن وہاں سے روانہ ہوتے سمے اس نے آ ریوا کہا (اس وقت تک کیلئے خدا حافظ، جب دوبارہ ملیں)۔

اس نے ھاتھی کو پٹلیا کی سمت جاتے دیکھا اور اس پیڑ کی طرف جس میں سے دو رسی نما جٹائیں لٹک رہی تھیں۔ پیڑ کے پیچھے دھول اڑ رہی تھی اور اس میں جانوروں کے سر ہی سر نظر آرہے تھے — لومڑیوں کے، گیدڑوں کے، بھیڑیوں کے اور چیتوں کے، لیکن دھول کی وجہ سے سب ایک ہی جیسے لگ رہے تھے۔ اور سبزے کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔

میر ظہیر عباس روستمانی

۵

صبح جب ڈاکٹر اپنے مریض کو دیکھنے کیلئے پٹیا کے پاس جس پر سے کسی زمانے میں ایک قابل استعمال سڑک گذرتی تھی پہنچا تو ہر طرف خاموشی تھی۔

بڑے دانتوں والے کو تمام جانوروں نے مل کر پیڑ کے پاس اس طرح پتھروں اور مٹی کے ڈھیلوں کی دیواروں کے بیچ میں کھڑا کر رکھا تھا کہ وہ قدم بھر بھی نہ آگے پیچھے کو ہٹ سکتا تھا نہ اِدھر اُدھر ہوسکتا تھا۔ اس کے دونوں خوبصورت لمبے دانتوں کی جڑوں میں برگد کی جٹاؤں کی رسیاں بندھی ہوئی تھیں اور دوسرے سرے پر وہ درخت کے سب سے اوپر کی ایک مضبوط شاخ میں باندھی گئی تھیں۔

مٹی کے ڈھیلوں اور پتھروں کی ان دیواروں کے چاروں طرف لومڑیاں، جنگلی کتے، بھیڑئیے لکڑبگھے اور چیتے قطاروں میں بیٹھے ہوئے تھے اور درخت کی جڑ کے نزدیک ایک

Scanned by CamScanner

نر-ورُ جذبات سے خالی خاموش بیٹھا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنی کانپیں ایک پتھر پر رگڑ لیتا تھا جیسے انہیں صاف کر رہا ہو۔

اس تمام سین سے دور، بہت دور، خرگوش، بندر ہرن، جنگلی چوہے اور مور چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے اور ایسا لگتا تھا انہیں نہ ہونے والے ڈرامے میں دلچسپی ہے نہ ہی اس کے خلاف کچھ کہنے کی سکت اُن میں ہے۔ حتیٰ کہ املی کے پیڑ پر بیٹھا ہوا سفید طوطا بھی خاموش تھا۔

ایک اتنا موٹا چیتا جو سالہا سال سے اپنی ضرورت سے زیادہ گوشت کھاکھا کر اتنا بھاری ہو چکا تھا کہ چلنے میں اس کی سانس پھولنے لگتی تھی ایک چبوترے پر بیٹھا ہوا اس تمام سین کو اُسی تمکنت سے دیکھ رہا تھا جس سے غالباً ائیراوت نے پہلے مرنے والے جانوروں کی قسمت کا فیصلہ کیا ہوگا۔

ڈاکٹر کو دیکھ کر کچھ جانوروں نے بڑی لجاجت سے اسے سلام کیا اور ہاتھ کے اشاروں سے اور جانورانی میں کہا "وہ رہا تمہارا مریض ڈاکٹر ـــــ خوش آمدید!"

ڈاکٹر نے زمین پر اپنا تھیلہ رکھا اور پسینہ پونچھتے ہوئے بڑے دانتوں والے کی سونڈ تھپتھپائی۔ ایسا لگتا تھا وہ اس خیال سے کہ آج کچھ ہونے والا ہے بہت تیز تیز چل کر یہاں پہونچا ہے۔ سونڈ تھپتھپانے کیلئے اُسے پتھر اور مٹی کے ڈھیروں کی دیوار پر سے اپنے اوپر کے دھڑ کو ننگھانا پڑا اور ایسا کرتے میں اس کی قمیص پر مٹی لگ گئی۔ بڑے دانتوں والے نے اس کی آنکھوں میں اپنی چھوٹی آنکھیں ڈال کر دیکھا اور آہستگی سے ڈاکٹر کی قمیص کی مٹی کو اپنی سونڈ سے جھاڑنے لگا۔

"چھوڑئیے عزت مآب یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے"
ڈاکٹر نے کہا
"اور مریض کو دیکھنے کا بھی کب ہے!" بڑے
دانتوں والے نے خشک ہنسی سے کہا
"بہرحال ڈاکٹر کا ایسے موقع پر ہونا ایک ریت ہے ــ
خواہ انسانوں ہی کی سہی ــ میرا خیال ہے کچھ باتیں ایسی
بھی ہیں جو جانور انسانوں سے سیکھ سکتے ہیں"۔
"مثلاً؟"

"مثلاً آخری دم تک ایک موت کی سزا دئیے جانے
والے کے پاس اس کے وکیل یا ڈاکٹر کا ہونا"

بڑے دانتوں والا کچھ دیر گپت رہا ــ پھر بولا "میں
پہلے سیاون کا گج (ہاتھی) تھا۔ پھر سرکس کا ہیم (سونا)
بنگیا اور مجھے روپا (چاندی) ملی۔ میرا ٹرینر مجھے گج راج
کہہ کر پیروں پر کھڑا ہونے کا اشارہ کرتا تھا کبھی اگلے
پیروں پر کبھی پچھلے پر ــ ان جانوروں نے مجھے ائیراوت
بنا دیا حتیٰ کہ میری جیون ساتھی اور میرے بچے تک مجھے
ائیراوت کہہ کر مخاطب کرنے لگے اور اب کچھ ہی دیر میں
میں بغیر دانتوں کا گوشت کا ایک ڈھیر رہ جاؤنگا"۔

ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے ــ
ایسا موقع اس کی زندگی میں بھی پہلی ہی بار آیا تھا۔

اس کے بعد جنگلی کتوں کی معیت میں ایک ہتھنی
اور تین مختلف عمروں کے بچّے اِس حصار کے پاس پہنچے ــ

بڑے دانتوں والا اپنی جیون ساتھی سے آنکھ ملاتے
ہوئے جھجھک رہا تھا اور وہ بھی اپنا سر نیچے کئے ہوئے
تھی ــ

ڈاکٹر کو خدشہ تھا آنکھ ملنے پر کہیں وہ وہی جملہ

نہ کہہ بیٹھے "میں نے تم سے نہیں کہا تھا...."

بڑے دانتوں والا اپنے آنسوؤں کو روک رہا تھا لیکن اس کی روپا رو رہی تھی۔

پھر کتوں نے بھونکنا شروع کردیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔

وہ چاروں خاموشی سے وہاں سے چلدیئے اور ان کے جانے کے بعد ہی موٹے چیتے نے دہاڑ کر کہا "شروع کرو"

لومڑیوں نے چیتے کے الفاظ کو دہرایا "شروع کرو"

اور سورٔ نے اپنی کانپوں سے نہایت پھرتی سے درخت کے تنے کو کاٹنا شروع کردیا۔

ڈاکٹر ھاتھی کی سونڈ کو پکڑے ہوئے تھا جس کا سرا اس وقت بالکل خشک تھا۔

سورٔ پھرتی سے کبھی ایک کانپ کو آری کی طرح چلاتا تھا کبھی دوسری کو، یہاں تک کہ درخت نے چرچرانا شروع کردیا۔

درخت کے دوسری طرف جدھر کو وہ جھکا ہوا تھا دو اور جٹائیں لٹک رہی تھیں جنہیں بھالوؤں اور بھیڑیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ جب درخت میں سے چرّاھٹ کی آواز آنے لگی تو انہوں نے ان جٹاؤں کو کھینچنا شروع کردیا۔

اب درخت زیادہ لچنے لگا تھا اور ائیراوت کو تکلیف ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا دانت نہیں وہ اس کا دماغ کھینچ کر باہر نکال رہے ہیں۔

پھر درخت زور سے چرّایا۔ بھالو اور بھیڑئیے اس کی زد سے بچ گئے اور سورٔ جڑ کے پاس سے کود کر ایک طرف کو ہوگیا اور اس سے قبل کہ ڈاکٹر کچھ سمجھ سکتا بڑے دانتوں والے

Scanned by CamScanner

کے دونوں دانت اُن جٹاؤں میں بندھے بندھے ہوا میں اس طرح اڑے جس طرح خیمہ گرنے پر اس کی میخیں طنابوں سے بندھی بندھی ہوا میں اڑتی ہیں بلکہ اُس سے بھی زور سے -

وہ بڑا درخت اور بڑے دانتوں والا دونوں اب زمین پر پڑے تھے اور مٹی اور پتھروں کی دیوار مسمار ہوچکی تھی - وہ چنگھاڑ جو دانتوں کے نکل کر ہوا میں اڑتے وقت ایراوت نے ماری تھی ابھی تک فضا میں گونج رہی تھی -

موٹے چیتے نے چلا کر کہا "دیکھو، زندہ ہے یا مر گیا"

لومڑیوں نے اس کے الفاظ دہرائے "دیکھو زندہ ہے یا مر گیا"

اور ایک بوڑھی لومڑی نے چیتے کے پاس جاکر مؤدبانہ لہجے میں کہا - "ابھی جیوت ہے"
چیتا سوچ میں پڑ گیا -

بھیڑیے اور لومڑیاں سوچ و بچار میں پڑ گئے - ایک نے کہا "ہمیں صرف اس کے دانت چاہیں تھے سو وہ ہمیں مل گئے ہیں - اب اور کچھ کرنے سے کیا فائدہ!"

دوسرے نے کہا "نہیں - اگر یہ بچ گیا تو کچھ ہی دن میں اس کے دانت دوبارہ آگ آئینگے اور وہ سچ مچ کا گج راج بنجائیگا اور ہمیں ہمیشہ ایک کھٹکا رہے گا، وہ آ تو نہیں گیا"

ایک اور نے کہا "نہیں کاؤنسل نے جب پورنماسی کی رات میں کھلے آسمان کے نیچے فیصلہ کیا تھا تو یہ بات طے شدہ سمجھی گئی تھی کہ اس ہاتھی کا خاتمہ ضروری ہے اور یہ بات اتنی ہی اہم ہے جتنا اس کے دانت اکھاڑنا"

Scanned by CamScanner

اس اثناء میں گیدڑ اور جنگلی کتے باقی ماندہ سبزہ خور جانوروں کو لومڑیوں کے جاری کردہ احکامات سنا رہے تھے کہ کسی کو بغیر اجازت اگنگ اور امنج کے بیچ کی زمین سے باہر جانے کی جرأت نہیں ہونی چاہئیے۔ اور نہ ہی بھوک کیلئے وہ چیتے کی گپھا کے باہر کسی قسم کا مظاہرہ کرینگے۔

مور خاموش تھے اور ہرن، پاڑھے، چکارے، سانبھر، چیتل، خرگوش ڈرے ہوئے بیٹھے تھے۔ کسی میں زبان کھولنے کی تاب نہیں تھی حتیٰ کہ ان میں بھی طاقت گفتار ختم ہوگئی تھی جنھوں نے بڑے دانتوں والے کی سزایابی کی خبر سن کر جشن منایا تھا۔

تب ہی پالتو کتوں کے بھونکنے اور گولیوں کے چلنے کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں —

کسی نے چلّاکر کہا "سور" سے کہو وہ اس کا خاتمہ اپنی کانپوں سے کردے"

بے دانت والا اب بار بار اپنا سر زمین پر سے اٹھاتا تھا جیسے اٹھ کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہو اور پھر وہ نڈھال سر خود اپنے بوجھ سے اپنے ہی خون سے لت پت زمین پر گر جاتا تھا۔

ہر طرف —— درختوں پر گدھ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

بندوقوں کی آوازیں نزدیک آتی جارہی تھیں۔ سب چلانے لگے 'کسان آگئے' — 'کسان آگئے' اور وہاں سے بھاگنے لگے۔

دو خرگوشوں نے بھاگنے سے پہلے نزدیک آکر بے دانت والے کو دیکھا اور ان میں سے ایک بولا "کیا ابھی ہے

حضرت سلیمان کی حکومت جس کا خواب ہمیں دکھایا گیا تھا!"

ان کے نزدیک سے ہوکر گذرنے والے ایک ہرن نے کہا "لومڑیوں کو کیوں نہیں مارتے ہیں؟ بڑے دانتوں والے کے مرنے سے کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے۔ وہی پرانے حکم سنائے جارہے ہیں"

ڈاکٹر نے اپنا تھیلہ اٹھایا اور گاؤں کی طرف چل دیا کیونکہ بے دانت والے سے کچھ کہنا اب فضول تھا۔ اس کے دماغ پر دھند چھا چکی تھی اور خون کی پھوہاریں اس کے اکھڑے ہوئے دانتوں کی جگہ سے پھوٹ رہی تھیں۔

ایک چیتل نے بھاگتے ہوئے کہا "مجھے لگتا ہے ہم نے غلط جانور کو موت کے گھاٹ اتاردیا — اس سے کہیں بہتر تھا کہ چیتے لومڑیوں کا خاتمہ کردیتے"

ڈاکٹر گاؤں کی سیما کے نزدیک پہنچ کر اس رپورٹ کے نکات اپنے ذہن میں ترتیب دے رہا تھا جو اسے جانوروں کی عادات کا مطالعہ کرنے والوں کی کانفرنس میں پیش کرنا تھی۔

کانفرنس میں پڑھے جانے والے مضمون کے کچھ حصے

"۔۔چھوٹے جانور محسوس کر رہے تھے کہ وہ ایک صحیح اور مؤثر نیتا کی غیر موجودگی میں بے سہارا اور غیر محفوظ تھے

ان میں یہ خواہش درندوں کی بداعمالیوں اور خون آشامی نے پیدا کی تھی جو اس طرح خود لیڈرشپ کا فقدان پیدا کرتے تھے اور خود اس خلا کو پُر کرنے کی اہمیت پر

زور دیتے تھے۔ چھوٹے جانور ان کی بات کو باور کرتے تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اس خلا کو پُر کرنے کیلئے جو چیز آئیگی وہ صبح کی ٹھنڈی ہوا ہوگی یا دوبارہ لُو کے جھکڑ۔ آنے والا نیا نیتا کیسا ہوگا یہ وہ نہیں جاننا چاہتے تھے۔

ان چھوٹے جانوروں کی افتاد طبع بھی عجیب تھی کبھی وہ پچھلے نیتاؤں کو یاد کرتے تھے، کبھی سوچتے تھے نیا آنے والا بانسری کی دھُن پر پورے جنگل کو جمع کرلینے والا کرشن کنہیا ہوگا یا یہ کہ وہ شہنشاہ سلیمان کا دور ان کیلئے واپس لے آئیگا۔ ان کی یہ توقع ہر بار ٹوٹ جانے کے بعد دوبارہ ان میں جنم لے لیتی تھی۔

اس سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جانوروں کی توقعات کا تعلق ان کے ماضی کے تجربات پر مبنی نہیں ہوتا ہے۔

ان معصوم چرندوں کے ذھن میں یہ خیال کبھی نہیں کلبلاتا تھا کہ نیتا خود ان میں سے بھی پیدا ہو سکتا ہے یا کیوں پیدا نہیں ہوتا ہے۔

اس لئیے اپنی زندگی کے نظام میں تبدیلیاں لانے کیلئے وہ لومڑیوں اور بندروں سے دوستی برقرار رکھنے کو نہایت اہم سمجھتے تھے اور یہ بھول جاتے تھے کہ وہ دونوں چاہے کتنا بھی چھوٹے جانوروں کی برادری سے تعلق رکھنے کا دعویٰ کرتے ہوں لیکن درپردہ ان کی کم عقلی پر ہنستے تھے۔ لومڑیوں اور بندروں کی تمکنت اور ان کی گوشت خوری ان نش کپٹ بھولے بھالے جانوروں سے پوشیدہ تھی جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کے یہ پتھ رکھشک (راستہ بتانے والے) ان سے زیادہ ان کے انڈوں یا نوزائیدہ بچوں کے گرویدہ تھے۔

درندوں کا چھوٹے جانوروں کے دماغ میں راجیہ کی

ضرورت کے احساس کو جگائے رکھنا اور موقع کی نزاکت جتلاکر انھی میں سے کسی کا خود راج سنبھال لینا یا اپنی جگہ پر نام کیلئے کسی بڑے جانور کو راج سنہاسن پر بٹھا دینا تاکہ معصوم جانوروں کا خوف کچھ کم ہو اور وہ جنگل کے ایک مقررہ خطے سے نکل کر دوسرے کی طرف نہ چل پڑیں بیک وقت جنگل کی آبادی میں سے ایک گروہ میں چالاکی کی افراط اور دوسرے میں اس کی کمی کو ظاہر کرتا ہے۔

چرندے بالخصوص وہ جو چھوٹے تھے اور اسی لئے زندگی کی ناہمواریوں کے خلاف زیادہ چلاتے تھے یہ دیکھنا بھول جاتے تھے کہ جن درندوں کے خلاف ان کا یہ یدھ تھا انھی کو انھوں نے اپنے لئے نیتا ڈھونڈھنے کا کام سونپ رکھا تھا۔ اور پھر وقت پڑنے پر یہ معصوم، جابروں اور خونخواروں کے راج سنہاسن پر بٹھائے ہوئے اس نیتا سے انصاف کے طلبگار ہوتے تھے۔

یہ اوپر کہا جاچکا ہے کہ زندگی کے ہاتھوں مار کھائے ہوئے ان جانوروں کیلئے درندے اپنی پسند کا نیتا چنتے تھے اور اس سروے میں ایک بے ضرر ہاتھی کو ایراوت کہہ کر ان کیلئے اسے بیک وقت قابل احترام اور ان میں خوف پیدا کرنے والی ہستی بنا دینا ان کی پیچیدہ سوچ کا پتہ دیتا ہے۔ ورنہ عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ معدودے ان چند جانوروں کے جو سمندر میں پائے جاتے ہیں جانور پیچیدہ سوچ کے حامل نہیں ہوتے ہیں اور مستقبل کیلئے پلاننگ کی اہلیت ان میں نہیں ہوتی ہے — ظاہر ہے بئے کا گھونسلا بنانا یا چونٹیوں کا خوراک کا ذخیرہ کرنا اس زمرے میں نہیں آتے ہیں۔

اس مطالعے میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ انسانوں کی طرح جانور بھی نہ صرف طاقت سے ڈرتے ہیں بلکہ اس کے پجاری بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً اگنگ اور امنج ندیوں کے بیچ کے اس مثلث میں پائے جانے والے ہرنوں کو بارہا چیتے کی کھال اور اس کے دھبوں کا مداح دیکھا گیا ـــ اس جنگل میں بھی جس میں بڑے دانتوں والے ہاتھی The tusker کی موت ہوئی اور اطراف کے جنگلوں میں بھی ـــ اور حالانکہ وہ چیتے سے ڈرتے تھے لیکن اس کے خونخوار دانتوں اور اس کے پنجوں میں چھپی ہوئی طاقت کا ذکر فخریہ کرتے تھے۔

اس روئیے کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ خود وہ طاقت اور خون آشامی کے ہتھیاروں سے محروم تھے اس لئیے اپنے قاتلوں کی ان صفات کو سراھنے میں نادانستہ طور پر وہ اپنے آپ کو جنگل کی سوسائیٹی میں اُن کی جگہہ پر رکھہ لیتے تھے جیسے وہ خونیں پنجے اور دانت ان کے جسم میں لگے ہوں اور وہ طاقت خود ان میں موجود ہو۔

بڑے جانوروں کا اپنی پسند کا نیتا ڈھونڈھنے کا عمل بھی انسان کی دنیا سے مماثلت رکھتا ہے ـــ اپنی پسند کے نیتا کو باآسانی اپنے رنگ میں رنگا جاسکتا ہے (اگر وہ پہلے ہی سے اُس رنگ میں نہیں رنگا ہوا ہے) اور بعد میں اس راج نیتا کے نقش قدم پر چلنے کا دعویٰ کرنا، یہ کہا جاسکتا ہے، نادانستہ طور پر اس گروہ میں بھی اپنے احساس جرم کو کم کرنے کا ذہنی عمل ہوتا ہے۔

ان دو گروپس یعنی بے ضرروں اور ضرر رسانوں کے بعد جب خود جنگل کی مخلوق کے راج نیتا کی ذہنی ساخت کو

Scanned by CamScanner

سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ گمان ہوتا ہے کہ اگر وہ بھی اس مطالعہ میں شریک لیڈر جیسا ہے تو اپنے احساس جرم کو وہ یہ کہہ کر کم کرتا ہے

"تم نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا"

حالانکہ زیر حوالہ بڑے دانتوں والا ہاتھی اپنی طاقت کے دور میں سب کچھ کرسکتا تھا اور سیدھے سادے جانوروں کا تعاون اسے شروع سے حاصل تھا لیکن وقت کو کھودینے کے بعد وہ اپنی کوتاہیوں کو پروجیکٹ کر رہا تھا کہ بڑے جانوروں نے اس کی سرشت بدل دی تھی۔ ان الفاظ کے پیچھے شاید اس کی یہ خواہش کار فرما تھی کہ کم سے کم اسے بے ضرر جانوروں کی نظروں میں کھویا ہوا وقار واپس مل جائے، جن کی جوکھوں اور دکھوں سے بھری ہوئی زندگی سے اس نے ہمیشہ چشم پوشی کی تھی۔

بندروں پر یہ دور جب ایک لیڈر کی مقبولیت مہینے کے دوسرے آدھے کے چاند کی طرح گھٹ رہی ہوتی ہے اور نئے نے ابھی ابھرنا شروع نہیں کیا ہوتا ہے اپنا علیحدہ تاثر رکھتا ہے۔ ان کے عمل اور ذہنی روش کو سمجھنے کیلئے ہمیں انسان کی سوسائٹی پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔ کچھ انسانوں کی طرح جو ایسے موقعوں پر دھرماتما یا دھرم کے پرستار بنجاتے ہیں وہ بھی ایسے اوسر پر چھوٹے جانوروں کو ایذا رسانی کے سخت خلاف ہوجاتا ہے۔ یہ اس کا دوسرا روپ یا Metamorphosis ہوتا ہے۔

کافی عرصہ تک اس روحانی دور میں ڈوبے رہنے کے بعد بالآخر وہ دوبارہ ٹڈوں کے پر اکھاڑ کر انہیں چبانا شروع کردیتا ہے۔ اس روحانی وقفے میں اس نے بھی اپنے اس احساس جرم کو کم کرلیا ہوتا ہے جو درندوں اور چھوٹے جانوروں

کے درمیان رابطہ پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے دور میں اس میں جمع ہوگیا ہوتا ہے۔ پھر وہ دور آتا ہے جب اس کی روحانیت سردیوں میں پتھروں کے نیچے سونے والے مینڈکوں اور کچھووں کی طرح اس میں سوجاتی ہے۔ اس دور میں اس کا رول وہ ہوجاتا ہے جسے موجودہ دور کی روزمرہ میں کرایے کا جانور کہا جاسکتا ہے — بِک جانے والا

بڑے جانوروں سے مراعات حاصل کرنا، بجائے خود رہنے کی جگہ بنانے کے بارش اور سردی میں خرگوشوں کی بِلوں پر قبضہ کرلینا اور جب ان گھر سے نکالے ہوئے ستم زدہ جانوروں کے بچے بارش کی تلیّوں میں ڈوب کر مر رہے ہوتے ہیں اور وہ راج نیتا کے پاس فریاد لے کر جانا چاہتے ہیں تو بھیڑیوں کی دھمکی انھیں ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے کیونکہ بھیڑیوں اور بندروں میں اس گوشت کی افراط کے دور میں گاڑھی چھن رہی ہوتی ہے۔ یہ گوشت چھوٹے درندے بندر کو بطور نذرانہ پہنچاتے رہتے ہیں تاکہ وہ راج نیتا اور اس کے محافظوں یا راجہ کے رکھشکوں سے کسی خاص معاملے میں ان کی سفارش کردے۔

اگنگ اور امنج کے اس مثلث کے جنگلوں میں اکثر بندروں کو ہرنوں کی پیٹھ پر سواری کرتے دیکھا جاسکتا ہے جسے وہ باوجود تھک جانے کے جھٹک کر علیحدہ نہیں کرسکتے ہیں۔

چھوٹے جانوروں کے دماغ میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ راج نیتا اور راجہ ان کیلئے ضروری ہیں اور بغیر ان دو کے جنگل میں رہنا ناممکن ہوگا کیونکہ ایسی صورت میں یا تو ہر طرف افراتفری ہوگی یا آس پاس کے جنگلوں کے درندے

ان کی زندگی اجیرن کردینگے اور ان کی آزادی کا خاتمہ ہوجائیگا۔

گویا خدا کی خوبصورت زمین پر بسنے اور اس کی خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہونے کیلئے وہ درندوں کے محتاج تھے۔

اس معاملے میں گہری سوچ میں ڈوبے رہنے والے بگلے بھی درندوں کے ہم خیال تھے۔ چھوٹے جانور اتنا سمجھنے سے قاصر تھے کہ انہیں کسی قسم کے تحفظ کی ضرورت نہیں تھی اور اس فلسفے کے پیچھے یہ حقیقت چھپی تھی کہ دراصل درندے اس امکان سے خوف زدہ تھے کہ یہ آبادی جسے چاروں ہاتھ پاؤں سے جی بھر کر لوٹا گیا تھا کہیں یکسر ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے یا نابود ہوجائے۔

درندے اپنی گپھاؤں ، کچھاروں اور اپنے غاروں اور بھاٹوں میں پروں اور کومل جانوروں کی ملائم بالوں والی کھالوں کے فرش پر بیٹھنے اور لیٹنے کے عادی ہوچکے تھے۔ ناشتے کیلئے انہیں جنگلی مرغیوں اور تیتروں کے انڈے اور جانوروں کے بچے درکار ہوتے تھے۔ وہ موروں سے سایہ کرنے کی خدمت بھی لیتے تھے اور انہی کے انڈے ان کی محبوب غذا تھی۔ اکثر جانوروں کا شکار وہ ضرورتاً نہیں تفریح کی خاطر کرتے تھے اور اس میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے کہ ایک دن میں کون بھیڑیا زیادہ سے زیادہ جانور مارسکتا ہے۔ تفخر کیلئے ایک بھیڑیا یا چیتا دوسرے کو بتاتا تھا کہ اس کی رہائش گاہ میں کتنی کھالیں ہیں ، کتنے ہرنوں کے سینگ ہیں۔

ایک موقع پر میں نے ایک ہرنی کو اپنے بچے کو بچانے کیلئے جنگلی کتوں کے ایک غول سے بے جگری سے لڑتے دیکھا تھا جو بچے کو دوڑاکر اس طرف لیجانا چاہتے تھے جدھر ایک

بھاری چیتا جو بھاگنے کی صلاحیت کب کی کھو چکا تھا
چھپ کر بیٹھا ہوا تھا اور جسے ملائم گوشت پسند تھا۔
لیکن ہرنی نے بچے کو اپنی ٹانگوں کے بیچ میں لے لیا تھا اور
باوجود اپنی تمام طاقت اور خون آشامی کی دہشت کے کتّے
اُس نیربل کے ارادے اور فیصلے سے خائف نظر آتے تھے۔
ہرنی اور اس کے بچے کی موت یقینی تھی لیکن خود ان میں
سے کون وہاں سے پیٹ سے لٹکتی ہوئی آنتیں لیکر جائیگا یہ
خیال انھیں سراسیمہ کئے ہوئے تھا۔

جنگلی کتّے اکثر اسی طرح شکار کا انتظام کرتے تھے
اور اس خدمت کے صلے میں خود چیتوں کی خوراک بننے
سے بچ جاتے تھے۔

ظاہر ہے ان تمام بد معاملگیوں کو چھپانے کیلئے درندوں
کو خود ایک لیڈر کی ضرورت ہوتی تھی جس کی موجودگی
ان کے عیوب پر پردہ ڈالے رکھنے کا کام کرتی تھی۔ یہاں
یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ 'ہاتھی کے پاؤں میں سب کا
پاؤں' کیوں کہا جاتا ہے۔

اس سروے میں وہ معصوم جن کے بچے تک محفوظ نہیں
تھے ایک عجیب ذہنی آواگون میں گرفتار دیکھے گئے۔ پہلا
وہ دور جب وہ ایک ایسے لیڈر کے ایک دن نمودار ہونے کا
خواب دیکھتے ہیں جو ان کی تمام تکالیف دور کردے گا،
شانتی کا ہر طرف راج ہوگا، ایسا دور جو وہ سنتے آئے ہیں،
کبھی صدیوں پہلے تھا۔ اس طرح وہ وقتی طور پر اپنی موجودہ
مشکلات کو بھُلا سکتے ہیں اور ایک دوسرے کو کسی مثبت
عمل سے روکتے بھی ہیں کہ اصل راج ابھی آنا ہے یا یہ کہ
اور جنگلوں کے حالات وہاں سے بھی بدتر تھے۔

لیکن اس کے بعد جب وہ نئے نیتا کو راج گدی

پر استھاپن کر چکتے تھے اور وہ ان کیلئے بجائے ایسا دور لانے کے بلائے جان بنجاتا تھا تو وہ چلّانے لگتے تھے۔ چونکہ ہرنئے نیتا کو وہ اس روپ میں دیکھتے تھے کہ اس کے جادو کی چھڑی گھمانے سے ان کے تمام دلدر دور ہوجائینگے اسی لئے جب حالات بد سے بدتر ہونے لگتے تھے تو وہ اس اکیلے ہی کو ان سب خرابیوں کی جڑ سمجھتے تھے۔ اس وقت ان پر ایسے علاقوں کی طرف جانے کی دھن سوار ہو جاتی تھی جہاں کے اپنے علیحدہ درندے ہوتے ہیں اور — جیساکہ اس سروے میں دیکھنے میں آیا — جو اس علاقے کے درندوں تک کو اپنے شکار کے پیچھے آنے دیتے تھے۔ ان مختلف جنگلوں کے درندوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک طرح کا بھائی چارا تھا۔

اگنگ اور امنج ندیوں کے اس مثلث میں کبھی کبھی تو ایک علاقے کے درندے دوسرے علاقے کے کسی مشٹھس درندے کو اپنے یہاں شکار پر مدعو بھی کرتے تھے جب کسی مرگلتے ہرن کو چھوٹے درندوں سے اس طرح دوڑوایا جاتا تھا کہ مہمان اسے باآسانی جھپٹ لے۔ ایک موقع پر ایک بوڑھے بیمار ہرن کو اس طرح دوڑایا گیا کہ جب وہ اپنے اصل شکاری کی کمین گاہ تک خود کو چھپانے کیلئے پہنچا تو جھاڑی سے دو قدم پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا اور لومڑیوں اور بندروں نے شور مچایا کہ مہمان چیتے نے، جو جثّے میں کسی بوڑھے موٹے ببر شیر سے کم نہیں تھا اور جس کی چلنے میں سانس پھولتی تھی، آج ایک طاقتور ہرن کا شکار کیا ہے۔

اس ذہنی آواگون میں معصوم جانوروں کی بے اطمینانی کا راگ جب اونچا ہوجاتا ہے تو درندے خود اس میں

شریک ہوجاتے ہیں اور چلانے لگتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہے اور اس کا ذمے دار صرف راج نیتا ہے۔ لیکن اس مطالعے سے یہ بھی پتہ چلا کہ اگر جنگل میں نئے لیڈر کے چناؤ کا کھیل کھیلا بھی جاتا ہے تو معصوم جانور یہ دیکھنا بھول جاتے ہیں کہ جسے لیڈری کیلئے لایا جارہا ہے اس میں وہ صلاحیتیں ہیں بھی یا نہیں جن کیلئے اسکو استھاپن کیا جارہا ہے — اس کا پچھلا کام کیا رہا ہے یا یہ کہ وہ راتوں رات بغیر محنت اور مشقت کے راج نیتی کے اصول سیکھ گیا ہے!

مثلاً اس واقعے میں چھوٹے جانوروں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ہاتھی کو تو خود اگر وہ جنگلی کتوں میں گھر جائے اپنا پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ وہ ان کی حفاظت کیلئے درندوں سے ٹکّر لینے پر آمادہ ہو جائے۔

جنگل کی بڑھتی ہوئی لاقانونیت سے برگشتہ ہوکر کبھی کبھی کوئی چیتا نظام جنگل سنبھال لیتا ہے اور دوسرے درندے اس کا ساتھ دیتے ہیں کہ اس کا راجیہ سنبھال لینا ضروری تھا۔ اس طرح ان کی وقعت خود اپنی نظروں میں بڑھ بھی جاتی ہے اور ہاچل وقتی طور پر دب جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ان درندوں کا ذہنی آواگون بھی چلتا رہتا ہے — اپنی پسند کے نیتا کا راج تلک کرنا — جو ان کی سیوا کرتا ہے، ان کے طور اپناتا ہے اور اس عمل میں وہ بھی اتناہی بدبودار ہوجاتا ہے جتنے خود جنگلی کتّے اور بھیڑئیے۔ پھر تمام عام جانوروں سے بڑھ کر کوئی ہستی، کوئی سُپر اینیمل، کے رتبے تک پہنچا دئیے جانے کے بعد (جیسے ائیراوت) اسے بلا اور بھوت کہا جانے لگتا ہے اور وہ راج سنگھاسن سے یا تو خود ہٹنے پر مجبور ہوجاتا ہے اور باقی عمر اپنی کوتاہیوں کا ذمّے دار دوسرے جانوروں کو ٹھیرانے میں گذارتا

ہے یا ختم کردیا جاتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ سب سے پہلے خود اس نے گلہریوں اور چھوٹی چڑیوں کا منھ بند کردیا تھا جن میں سے اکثر بھینسوں اور بڑے چرندوں کی پیٹھ پر بیٹھتی ہیں اور چرندے مطابق اسے نہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں نہ خود پر بوجھ۔ یہ وہ جانور ہوتے ہیں جنہیں قحط اور سیلاب کی آمد کے نقیب کہا جاسکتا ہے اور جو معصوم جانوروں کو درندوں کی آمد سے آگاہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کسانوں کی گائے، بھینسوں اور بیلوں کا مارا جانا اس لئیے کہ کسی چڑیا نے انہیں آگاہ نہیں کیا تھا خود ان درندوں پر کسانوں کا عتاب لاتا تھا۔ ان نقیبوں میں سے کچھ خود خاموش رہنے کو مصلحت سمجھتے تھے اور اپنی خاموشی کو درست گردانتے تھے لیکن وہ بھول جاتے تھے کہ اس طرح وہ خود بھی اس کشت و خون میں شریک ہوتے تھے کیونکہ مثلاً خطرے کی آمد پر انہوں نے بچے والی ہرنی کو آگاہ نہیں کیا تھا۔

سنگھاسن سے اتارا ہوا بڑے دانتوں والا ہاتھی کتنا سادہ لوح تھا جو یہی سمجھتا رہا کہ معصوم چرندوں سے اس کی وفاداری کا یہ تقاضہ تھا جس نے اسے لوہے کے خاردار تاروں کی دیوار کو توڑنے پر مجبور کیا تھا ـــ اسے نہیں معلوم تھا یہ معصوم جانور تو خواہش کرنے کی حس کب کی کھو بیٹھے تھے اور اس سے انہیں اس قسم کے کسی کام کی توقع کم تھی یا بالکل ہی نہیں تھی۔ اگر یہ توقع تھی تو درندوں کو تھی جو چرندوں کے نام پر اس سے دیواریں گرواتے تھے اور باڑھیں تڑواتے تھے اور جس کے کرنے میں اس کی کھال رگس بھی کھاجاتی تھی۔ بڑے پیٹ والے ان جانوروں کو انتاس

سے کم کوئی چیز درکار نہیں ہوتی تھی اور اچھے سے اچھے آلو ــــ جن تک باڑھ کے گرنے پر چرندوں کے منھ تک نہیں پہنچتے تھے ۔ ان کے حصّے میں پتے یا کُترے ہوئے آلو اور شکرقندیاں اور بیکار کٹے ہوئے چقندر آتے تھے ــــ سور اور بھالووں یعنی بڑے جانوروں کا بچا کھچا ۔

درندوں کے حصّے میں ہر چیز اچھی سے اچھی آتی تھی مثلاً ان فارمز (کھیتوں) میں چھپے ہوئے خرگوش اور بھیڑیں جو اعلیٰ اور قیمتی ترکاریوں اور پھلوں پر پلے ہوتے تھے اور جن کے بارے میں یقین کیا جاتا تھا کہ ان کا گوشت عام چرندوں سے بہتر ہوتا ہے ۔

بڑے دانتوں والے ہاتھی کو یہ بھی ٹھیک سے نہیں معلوم تھا کہ جنگل کی گھاس اور جھاڑیاں ان درندوں کی وجہ سے یا تباہ ہو رہی تھیں یا انہیں جلایا جاتا تھا تاکہ انہیں وہاں سے بھگایا جاسکے ، لیکن اسے یقین تھا کہ اگر چرندوں کو سبزہ نہیں ملتا تو ان کی نسلیں ختم ہونے لگتیں اور اگر وہ نہ رہتے تو بھیڑئیے ، چیتے اور لکڑ بگھے کیا کھاتے ۔

اسے وہ جنگل کی زندگی کا ضابطہ سمجھ رہا تھا چنانچہ جس طرح راج نے چھوٹے جانوروں کے دماغ میں یہ بٹھا دیا تھا کہ بغیر راجہ اور اسے قائم رکھنے والوں کے زندگی کا تصور ناممکن ہے اسی طرح ٹسکر بھی اس وہم میں گرفتار ہوتا چلاگیا کہ وہ خود دوسروں کیلئے ناگزیر ہے اور اس کی تمام حرکات قدرت کے کسی پیچیدہ عمل کو پورا کررہی تھیں ۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ اتنا سادہ لوح تھا کہ اسے نہیں معلوم تھا کہ بالخصوص چھوٹے چرندے جو اس کی بارگاہ سے دور رہتے تھے حالات کے صحیح طور پر

Scanned by CamScanner

معلوم نہ ہونے کی وجہہ سے صرف اسی کو موردِ الزام ٹھیراتے تھے۔ اس بے مقصد جانوں کے زیاں کا اور معصوم جانوروں اور ان کے بچوں کے غائب ہوجانے کا۔ اسے نہیں معلوم تھا جس طرح لومڑیاں، بندر اور دوسرے خون ریز جانور اس کے معلّم تھے اسی طرح وہ ان اجل گرفتہ معصوموں کو بھی برابر پٹی پڑھاتے رہتے تھے کہ گمشدگانوں کی ذمّے داری تمام تر ان کے راج نیتا پر عائد ہوتی تھی اور یہ کہ دوسرے جنگلوں میں ان کا جانا بے سُود تھا کیونکہ اپنا جنگل کا ٹکڑا اپنا جنگل کا ٹکڑا ہوتا ہے اور ہر دوسری جگہہ کی لاقانونیت زمین کے اس ٹکڑے سے بڑھ کر تھی۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے وہ حقائق سے واقف تھا لیکن مکمل طور پر نہیں یا یہ کہ چونکہ وہ خود ان میں سے نہیں تھا بلکہ باعتبار پیدائیش بڑے جانوروں کا نمائندہ تھا اس لئیے اس کا ماحول اس کیلئے نمک کی کان ثابت ہوا تھا جس میں جاکر وہ خود بھی نمک کی ایک پہاڑی بنکر رہ گیا تھا۔ جیسے ماحول نے اس میں سے عمل کی قوت سلب کرلی تھی۔

پچھلا راجیہ اسے ورثے میں ملا تھا۔ پچھلے راجیہ ہی نے اس کا راج تلک کیا تھا اور اسے راج کرنا سکھایا تھا اور اس عمل میں آہستہ آہستہ خود وہ اسی پرانی راجیہ مشینری کا ایک پرزہ بنتا گیا۔

بعد میں اپنے ان راج گرووں کو وہ کیسے ناراض کرسکتا تھا اور اگر کرتا تو یہ اس کیلئے مہنگا سودا ہوتا۔ اپنے سنہاسن کو سنبھالے رکھنے کیلئے اسے ان کو ہر معاملے میں کُھلی چھوٹ دینی پڑی اور یوں وہ آہستہ آہستہ خود اس ختم کردینے والے عمل کا شکار ہوگیا۔ لیکن راجیہ کی

Scanned by CamScanner

مشینری خود اس انقلاب سے بغیر کسی قسم کی ہانی کے
نکل آئی۔

اس سروے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جنگل کے جانوروں کی زندگی کا مطالعہ اور ان کی روش اور روئیے کا مشاہدہ نہ صرف انسانی زندگی میں ایک فرد کی حِس اور روش کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ مختلف سوسائٹیوں میں پائے جانے والے مشترکہ رویوں اور رجحانات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ جانوروں کا حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار، اپنی جملہ صعوبتوں کیلئے کسی ایک ہستی کو اس کا سبب سمجھ لینا اور بجائے صعوبتوں کی اصل وجہہ دور کرنے کے اس ناپسندیدہ ہستی کو مٹا دینے کی زبردست خواہش کے الاؤ کا ان میں جل اٹھنا، اس کے بعد اپنے اس عمل پر پچھتاوا کہ پچھلے نیتا کی قدر نہیں کی گئی اور ہر بار نئے مسیحا کی تلاش — جانوروں کا یہ نیوروٹیسزم اسی نوعیت کا ہے جیسے بغیر ہل چلائی سخت اور بے آب زمین پر ایک بیج ڈال کر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ وہاں چند ہی دن میں اس کی فصل لہلہا رہی ہوگی۔ لیکن انسانی سوسائٹیوں کی طرح وہ بھی یہ دیکھنا بھول جاتے ہیں کہ وہ بیج بغیر جتی ہوئی زمین پر رائیگاں جاتا ہے اور جاگریتی کے بغیر کسی سوسائٹی میں کسی بڑی صحتمند تبدیلی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

یہ رائے اکثر سننے میں آتی ہے کہ چوہوں پر کئے ہوئے نفسیاتی تجربات سے نکلنے والے نتائج کی روشنی میں انسان کی حِس، روش، روئیے اور ردِ عمل کو سمجھنے کی کوشش کرنا اس لئیے غلط ہے کہ خود تجربہ گاہ کے چوہوں پر کئے ہوئے تجربات کے نتائج کا اطلاق کھیت اور کھلیان

Scanned by CamScanner

کے چوہوں کی جبلّت اور روش پر نہیں ہوسکتا ہے۔ لیکن اس مطالعے کے پیش نظر شاید یہ کہنا درست ہے کہ نہ صرف ایک جانور کے روئیے اور روش سے انسان کے روئیے اور روش کے بارے میں آگہی ہوتی ہے بلکہ ہم جانوروں کی مشترکہ زندگی میں انسانوں کی سوسائٹی کا ڈھانچہ دیکھ سکتے ہیں۔ اور اس کا الٹ بھی درست نظر آتا ہے کہ انسانوں کی سوسائٹی کے ڈھانچے اور اس کے عمل کو جانتے ہوئے جانوروں کی سوسائٹی کو بھی سمجھا جاسکتا ہے ـــ بشرطیکہ دونوں طرح کی آبادیاں یکساں ذھنی طورپر سوئی ھوئی ہوں۔

اس مضمون کی تیاری میں صرف بڑے دانتوں والے ھاتھی کے علاقے میں کئے جانے والے سروے کے نتائج سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے۔ جانوروں کی جبلّت، روش اور ردِعمل کے بارے میں جو آراء قائم کی گئی ہیں وہ اطراف کے جنگلوں کی زندگی کے مشاھدات پر بھی مبنی ہیں ـ نہ صرف یہ بلکہ بعض فیکٹرز مثلاً خوف، عمل کا فقدان، اصلی مسئلے سے پہلو بچانا اور پچھڑے اور زندگی سے مارکھائے ھوؤں کا اپنے آپ کو ایک برادری نہ سمجھنا جبکہ ان کے کرپاھین دشمنوں میں ایکتا ہے اسی علاقے کی انسانی آبادی اور جانوروں میں کافی حد تک مشترک نظر آتے ہیں ـ

اس لئیے ان علاقوں میں جن کا سروے کیا گیا ہے جانوروں کی بقا دشوار نظر آتی ہے اور ان کی موجودہ طرز زندگی کے پیش نظر ان کے پھلنے پھولنے کا امکان بہت کم ہے ـ

مضمون کے اختتام پر جو بحث ہوئی اُسے سمیٹنے

Scanned by CamScanner

کیلئے کانفرنس کے صدر نے آخیر میں صاحب مضمون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاید اُس علاقے کے جانوروں کا مقسوم جانور ہی رہنا ہے اور ارتقا کے عمل میں وہ ہومو سیپینز (انسان) کے رتبے تک نہیں پہنچ پائینگے"

حاضرین جلسہ میں سے کسی نے کہا "اور وہ بھی ان کے حق میں اچھا ثابت نہیں ہوگا"

"کونسا اُس رتبے پر پہنچکر انسان خوش ہے!" کسی اور نے کہا۔

Scanned by CamScanner

میری موت

میری موت کو کسی اعتبار سے بھی غیر معمولی نہیں کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُن تمام واقعات کو جو میرے دم توڑنے کے بعد رونما ہوتے گئے۔

اُن تمام مناظر کی لڑی کو اب جب میں دور سے دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کسی عام فلم کے پٹے ہوئے سینوں کا ایک سیکوئینس تھا جسے میں دیکھنے یا محسوس کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن یہ مجبوری اُس وقت بھی ہوتی جب میں کسی اور کو مرتے دیکھتا اور اس کے بعد جو فرسودہ سین ایک کے بعد ایک سامنے آتے جاتے۔ اور باوجود خواہش ہونے کے میں وہاں سے ٹل نہ پاتا کہ کٹھور، بے مروت یا طوطا چشم سمجھا جاؤنگا۔

فلم کی بات دوسری ہے۔ ایسا بارہا ہوا ہے کہ میں اکتا کر اپنے ساتھیوں کو ہال میں بیٹھا چھوڑ کر باہر چلا آیا۔ اِدھر اُدھر پھرا، پیٹ کا وزن ہلکا کیا، ایک روہٹو یا کوک اور جب دوبارہ لوٹ کر آیا تو کہانی کو سمجھنے میں قطعاً دقت پیش نہیں آئی۔ صرف چند گانے یا بارہا کے دیکھے ہوئے سین اس اثناء میں پروجیکٹر کے ایک اسپول سے کھل کر دوسرے پر لپٹ گئے تھے اور یہی کچھ میری موت کے وقت پیش آیا۔

لوگوں نے بارہا دیکھا ہوا سین دوبارہ دیکھا، کچھ

Scanned by CamScanner

گھبرا رہے تھے اور باہر جاکر بیٹھ گئے تھے ۔ ایک آدھ مجھ سے کلمہ دھروا رہا تھا ۔ یہ اس بات کی ضمانت تھی کہ میں ایمان کی حالت میں مر رہا تھا اور چونکہ ایمان کی حالت میں مر رہا تھا اس لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ جنت اچھی جگہ بتائی جاتی ہے ۔

لیکن اس وقت جب کہ میری ٹانگیں ہلنے سے تو کیا کچھ محسوس کرنے تک سے عاری ہو چکی تھیں اور یہی حالت قریب قریب ہاتھوں کی بھی تھی میں کلمہ پڑھوانے والی خاتون سے کیسے کہتا

"بیوی میں نے تم سے بارہا کہا مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا کیونکہ میں مرنے کے بعد کسی غیر کے گھر نہیں جاؤنگا ۔ وہ بھی اپنا ہی گھر ہوگا ۔ تم خدا کے گھر کو غیر کی جاگہ سمجھتی ہو اس لئیے موت کا نام سنکر کانوں پر ہاتھ رکھتی ہو ۔ میں اس زندگی سے پہلے کے گھر کو، گو میں اسے قطعاً بھول چکا ہوں ، اس زندگی کی قیام گاہ کو اور بعد میں جہاں کہیں بھی جانا ہوگا ایک ہی کا گھر سمجھتا ہوں ، اس لئیے جب موت آئیگی بے چون و چرا مرجاؤنگا ۔ اتنی پٹی ہوئی تھیم میں میرے لئیے نہ اب سسپینس بچا ہے نہ دلچسپی ۔

" البتہ یہ جنت والا تصور میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے ۔ تم جانتی ہو میں چپچپاتی ہوئی ہر چیز سے بدکتا ہوں " ۔

اس سے زیادہ اس نے مجھے کبھی بولنے کا موقع نہیں دیا ۔ نہ ہی میرے یہانتک کہنے پر اس لیے کبھی پابندی عائد کی تھی ۔ میں اس کی اس آزادیٔ گفتار دھندگی کو سراہتا تھا اور وہ میرے خاموش ہوجانے کو ۔

لیکن اس وقت میں کیا کرتا۔ وہ رو رہی تھی اور کلمہ ختم کرنے کے بعد اب یٰسین پڑھ رہی تھی۔ مجھے اسی صبح ہسپتال سے گھر لایا گیا تھا کیونکہ عادت کے مطابق ڈاکٹر جواب دے چکے تھے اور عادت کے مطابق حکیم، ہومیوپیتھ وغیرہ بھانپ چکے تھے کہ میرے کیس کو لینا گھاٹے کا سودا ہے۔

چنانچہ اس خاموش ڈیکلیریشن کے بعد کہ میں اب اور بہت سوں کے ایک ہی سمت جانے ہوئے نقوش قدم پر چلنا شروع کرنے والا ہوں گھر مہمانوں سے بھر گیا۔

پورا سیناریو گھسا پٹا تھا۔ یٰسین پڑھنے کی آوازیں، ایک سیاہ بکرے کو میرے پاس لایا گیا اور اس کی پیٹھ پر میرا بے جان ہاتھ چھوایا گیا۔ میں جانتا تھا مجھ سے پہلے اس بکرے کو اس کے متقدمین کے نقوش قدم پر روانہ کیا جانے والا ہے۔ لیکن ان مورکھوں کو اتنا نہیں معلوم تھا کہ میرا دماغ اس گری پڑی حالت میں بھی اچھے سے اچھے کمپیوٹر کو کم سے کم شطرنج کی ایک آخری بازی میں شکست دینے کی صلاحیت رکھتا تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ ان کی یہ بکرے والی چال بے مقصد تھی۔ بعض میتوں میں جن میں مجھے بچپن میں شوق سے اور بعد میں جبراً قہراً شریک ہونے کا موقع ملا تھا یہ صرفہ بے جا میں نے ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میری نظر میں وہ لوگ میرے گھر والوں سے زیادہ حقیقت فہم اور حقیقت پسند تھے۔

میرے منھ پر قرآن مجید کے صفحات کی ہوا دی گئی جن میں گلاب کے پھولوں کی مہک تھی۔

کسی نے میرے منھ میں پانی کے چند قطرے ڈالے جو میں جانتا تھا زم زم کے کنوئیں کے ہیں۔ اسی طرح میرے

منھ میں مٹی کی تقریباً چوتھائی چٹکی ڈالی گئی جو خاک شفا تھی۔

جس وقت کوئی میرے منھ میں مٹی ڈال رہا تھا تو کسی اور نے کہا تھا "بس برائے نام ڈالنا۔ کہیں سانس کی نالی میں نہ چلی جائے"۔

لیکن بجائے 'تھینک یو' کہنے کے میراجی اس وقت چاہ رہا تھا میں مٹی ڈالنے والے سے کہوں:

تھوڑی دیر میں آنکھوں میں منھ میں ہرجگہ مٹی ہی مٹی ہوگی۔ اس تکلّف کی کیا ضرورت تھی اور ڈالنا ہی تھا تو منھ مٹی سے بھر دیتے۔

میںنے لوگوں کے رونے کی آوازیں سنیں اور رونے والوں کو چپ کرانے والوں کی۔ کسی کسی کی ناک کے اندر بہہ کر آجانے والے آنسوؤں کو سوں کرکے اوپر سٹکنے کی صدا بھی آجاتی تھی۔ دو ایک بار کسی نے میری اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی آنکھوں کو ایک جگہ ٹھہرانے کیلئے میرے سامنے خانۂ کعبہ اور مدینہ منورہ کی تصویریں رکھیں۔ لیکن مجھے ان میں دلچسپی نہیں تھی۔

آسی اسٹینڈرڈ زاوئیے سے کھینچی ہوئی دو تصویریں جو زندگی سے تہی ہوتی ہیں، جنہیں کھینچتے یا بناتے وقت آپچ اور عقیدت کی بجائے کمرشل نفسیات کے اصول برتے جاتے ہیں۔ چنانچہ جاپان کی بنی ہوئی ان تھری۔ڈی۔تصویروں کو بہتر قسم کے ڈرائینگ رومز میں دیکھا جا سکتا ہے اور جنہیں کم زیب دیوار اور سپاٹ کہا جانا چاہئیے۔ وہ حجّاموں کی دوکانوں، تنوروں اور معمولی قسم کے مکانوں میں نظر آتی ہیں۔

مجھے ان میں دلچسی نہیں تھی۔

میری اس وقت صرف ایک ہی خواہش تھی— اور وہ

Scanned by CamScanner

پوری نہیں ہوسکتی تھی — کہ میں تھوڑی دیر کیلئے یہاں سے اٹھکر اس جمگھٹے کو چھوڑکر کہیں چلا جاؤں۔ اِدھر اُدھر کا چکر مارنے تاکہ یہ پچاسوں دفعہ کے دیکھے ہوئے سین میری غیرحاضری میں گذر جائیں۔ ان میں نوینتا ہی کیا تھی!

چنانچہ بولنے کی سکت نہ ہونے کی وجہہ سے میں‌نے آنکھیں بندکرلیں۔

"غفلت طاری ہورہی ہے" کسی نے کہا

اس کے جواب میں دوسری آواز آئی "سکرات موت ہیں"

پھر کسی نے سرگوشی میں کہا "میں جب یہاں آئی تھی تو سب سے پہلے میری نظر ناک پر گئی تھی۔ بانسہ تو اسی وقت ٹیڑا ہوچکا تھا۔ خیر۔ سب اپنی سی کرتے ہیں اور آخیر دم تک کرتے ہیں"

میں نے آنکھیں کھول کر اُس عجیب عورت کو دیکھا۔ اس کے بال سفید ہو چلے تھے اور پورا جسم تھل تھل تھا۔ پھر بھی اس عمر کو پہنچ جانے پر بھی اس کی اس سین میں دلچسپی کم نہیں ہوئی تھی اور اپنی علمیت پر جیسے اُسے ناز تھا۔

اس کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی نے کہا

"وہ آنکھیں کھولیں!"

بڑھیا نے کہا "سکرات موت ہیں"۔

میں‌نے آنکھیں بند کرلیں۔

پھر اسی لڑکی کی آواز آئی — مدھم، اتنی مدھم کہ اسے میرے سوا شاید ہی کسی اور نے سنا ہو "اچھی امّی تم نے کیسے پہچان لیا تھا؟"

"کیا؟" بڑھیا نے کہا

"کہ بانسہ ٹیڑھا ہوچکا ہے"

بڑھیا اس کے کان میں کچھ کُھس کُھس کرنے لگی۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ آنکھوں سے ہاتھوں اور انگلیوں کا کام لے رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ لڑکی کی نظریں بھی میرے جسم کے مختلف حصوں کی طرف گھوم جاتی تھیں۔

میں ہنسنا چاہتا تھا کہ مسٹری میرے جسم سے بیڈ سائیڈ ڈیمنسٹریشن کا کام لے رہی ہے۔ جس طرح میڈیکل کالج ہسپتالوں کے وارڈز میں کیا جاتا ہے۔

پھر میں نے پیاس سے بمشکل تمام ہونٹ کھول کر ان پر زبان پھیرنا چاہی۔

بڑھیا نے جو معلومات کا خزانہ تھی کہا "کچھ کہنا چاہتے ہیں"۔

لوگ اپنے کان میرے ہونٹوں کے پاس لے آئے اور ان میں سے ہر ایک یہی کہہ رہا تھا "آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ کیا بات ہے؟"

ان کے سروں میں سے کھوپرے، سرسوں اور مختلف قسم کے دوسرے خوشبودار تیلوں کی بو آرہی تھی اور ان کے میل سے اٹے ہوئے کانوں کا اپنے منہ سے اتنے قریب ہونے کے احساس پر مجھے ابکائی سی آئی۔ لیکن یہ میری مرضی کے خلاف ہورہا تھا۔

بڑھیا نے میرے پیر چھوئے، پھر ہاتھ اور آخر میں ماتھا۔

پھر اس نے لڑکی سے کہا "ہاتھوں پیروں کی روح نکل چکی ہے بس اب آنکھوں اور حلق میں اٹکی ہے"۔

لڑکی نے ڈرتے ہوئے کہا "پھر کہاں جائیگی؟"

بڑھیا نے کہا "جہاں سے آئی تھی"

میر ظہیر عباس روستمانی

Scanned by CamScanner

میں نے آنکھیں بند رکھنے ہی میں عافیت سمجھی۔

مجھے ایک چیل کی موت یاد آئی جس نے سڑک پر پڑے ہوئے بھورے رنگ کے تازہ مرے ہوئے خرگوش کو اٹھا کر لیجانے کیلئے پروں کو سادھ کر ہوا میں غوطہ لگایا تھا لیکن غوطہ ادھورا ہی رہ گیا اور جس وقت ٹرک اپنی تیزرفتاری میں اسے اپنے پیچھے چھوڑ کر ان دونوں پر سے گذر گیا تو میں نے اپنی گاڑی ان کے پاس پہنچ کر آہستہ کی۔ چیل کی ایک لمحہ پہلے کی رفتار اور اب اس کے بے حرکت جسم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس وقت میں نے سوچا تھا 'کیا چیز تھی جو نکل کر آس پاس کی فضا میں گم ہو گئی تھی' اور بغیر سوچے سمجھے اپنے چاروں طرف نظریں دوڑائی تھیں۔

وہاں صبح کا دھندلکا تھا، پانی میں سے سر ابھارے ہوئے چاول کے پودے، خاموش پیڑ اور ایک پاتر کچھوا جو سڑک کے کنارے ٹھہر کر شاید حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ممکن ہے سوچ رہا ہو سڑک پار کی جاسکتی ہے یا نہیں۔

لوگوں کے آنے اور جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ فلاں کو فون کردیا گیا ہے یا نہیں؟ کس کو تار دیا جاچکا ہے۔ قرآن پڑھنے کی آوازیں، سسکیاں اور سسکیاں، ٹرے میں بجتی ہوئی چائے کی پیالیوں کی آوازیں جو آنے والوں کیلئے لیجائی جارہی تھی۔

میں وقت گذاری کیلئے مرنے والوں کا حساب کرنے لگا۔ کیس کیس کو میں نے مرتے دیکھا تھا۔ بچپن سے لیکر ابتک۔۔ فلاں صاحب جو سڑک پر نظر آتے تھے پھر غائب ہوگئے، فلاں ماموں، چچا، یہ زاد اور وہ زاد بھائی اور بہن، ماں، باپ، داماد، بہو، سمدھی، سمدھن، بیٹا، پوتا، بھتیجہ، بھتیجی، بھانجہ، بھانجی، اسکول اور کالج کے ساتھی، ساتھ

کام کرنے والے، بچپن میں جن انجانوں کی موت یا میت میں میں اپنی ماں کے ساتھ، شریک ہوا تھا، اساتذہ۔

پھر دماغ میں ان رشتوں کی فہرستیں آئیں جن کا ذکر قرآن اور بھاگوت میں دو مختلف مضامین کے تحت کیا گیا ہے — میری اپنی فہرست خاصی مکمل تھی۔

گاہے گاہے اس قسم کی آوازیں بھی کانوں میں پڑتی رہیں 'ابھی سانس باقی ہے'۔

'نبض نہیں ہے'

'نبض ہے لیکن بہت ہلکی ہے۔ نہ ہونے کے برابر'

اس کے بعد میں نے دم توڑ دیا۔

گھر میں کہرام مچ گیا اور جو تھوڑی بہت عزت میرے جسم کو اب تک مل رہی تھی ساتھ ہی میں وہ بھی ختم ہو گئی۔

اب میرا جسم بغیر مجھ سے پوچھے ہوئے دوسروں کی ملکیت تھا۔ کسی نے میری بند ہوئی ہوئی آنکھوں کو بے وجہ بند کرنا چاہا۔ کسی نے میری ٹانگیں سیدھی کر دیں اور پھر دونوں کو جوڑ کر ان کے انگوٹھوں کو پٹی سے کس کر آپس میں باندھ دیا۔ میرے ہاتھ پہلے میرے سینے پر رکھ دئیے گئے۔

پھر کسی نے کہا 'انہیں سیدھے کرو'۔ انہیں سیدھا کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد پھر کسی نے انہیں میرے پیٹ پر رکھ دیا۔ میرے جبڑے کو اوپر اٹھاکر سر سے باندھ دیا گیا اور منھ کو چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔

یہ سب کچھ میرے جسم کے ساتھ بغیر مجھ سے اجازت لئیے کیا جارہا تھا۔ یعنی میں مٹی تھا۔ پھر اگر میں مٹی تھا تو یہ احترام کس لئے تھا! ہر ایک آہستہ آہستہ بول رہا ہے۔ درود پڑھا جارہا ہے میرے ارد گرد کچھ اگربتیاں سلگادی

Scanned by CamScanner

گئی ہیں اور ایک چنگیری میں لوبان سلگ رہا ہے۔ آنے والوں کا تانتا۔ باہر سے آنے والوں کا انتظار۔ مجھے آج پتہ چل رہا تھا فلاں ٹرین کتنے بجے یہاں پہنچتی ہے اور بسیں کتنے بجے سے کتنے بجے تک چلتی رہتی ہیں۔

بعضوں کا خیال تھا صبح سے پہلے مجھے سپردِ خاک نہیں کیا جاسکے گا کیونکہ میرے دو بھائی باہر سے آرہے تھے اور حالانکہ فلائیٹ صرف چار گھنٹے کی تھی لیکن درمیان میں فوری کنکشن نہ ملنے کی وجہ سے ان میں سے ایک صبح چھ بجے پہنچے گا دوسرا آٹھ بجے۔

دوسرا گروہ اس انتظار کے حق میں نہیں تھا۔ مجھے اسی عورت کی آواز سنائی دی "برف کا انتظام ہو گیا ہے؟ صبح تک تو لاش میں سے بُو آنے لگے گی"

مجھے جو اُس سے نفرت ہو چلی تھی وہ اس کے اس پریکٹیکل انداز فکر کو سرھانے میں مانع نہیں ہوئی۔

میں نے اپنے دل میں کہا 'حرامزادی کو سب گُر آتے ہیں' کاش ساری رات یعنی اگر تدفین اگلی صبح تھی یہ میرے پاس بیٹھی رہے اور میں موت کی جزئیات اس کی باتیں سُن سُن کر اپنے ذھن میں بٹھالوں۔ پھر خدا مجھے دوبارہ زندہ کرے اور یہ پہلے مرے اور میں اِسے اسی طرح رات بھر ہتھیلی کے پھپولے کی طرح سنبھال کر رکھوں اور صبح کفنا دفنا کر آؤں۔ بہرحال پرانی تھیم کو دیکھنے اور خود پرانی تھیم پر فلم بنانے میں کافی فرق ہے۔

لیکن میں بے حس و حرکت پڑا تھا اور میرے اوپر کی سفید چادر میرے سر پر چلنے والے پنکھے کی وجہ سے میرے جسم پر پھٹپھٹا رہی تھی۔ دو ایک بار ایسا بھی ہوا کہ

چادر سر یا پیر پر سے اتر گئی اور کسی نے دوبارہ جلدی سے وہ حصہ ڈھک دیا۔

یہ اس گھر میں میری آخری رات تھی اور مجھے اس میں کسی قسم کی رومانیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یوں بھی رومانیت کا میں سدا سے مخالف رہا ہوں۔ مصنف یا فنکار کے پاس جب گہری سوچ یا زندگی سے نزدیک ہونے کا فقدان ہوتا ہے تو وہ رومانیت اور ابہام کا سہارا لیتا ہے۔ اگر معاشرہ اجازت دہ Permissive ہو تو جنس کا، اور اگر بڑے پیمانے پر سماجی اور ذہنی بحران کا شکار ہو تو وہ مذہبیت کا عصا تھام کر بدقت تمام کھڑا ہو پاتا ہے۔

میرا کمرہ نسبتاً خالی تھا اور لوبان اور اگربتیوں کے دھوئیں سے پٹا پڑا تھا۔

لوگ اب مختلف ٹولیوں میں بنٹ چکے تھے جیسا کہ اس موقع پر ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔ دوسرے کمروں میں میری ارضی زندگی کے آخری لمحات کی ریل بار بار میرے مکالمے ڈب کرکے چلائی جارہی تھی — کس طرح میں نے بیماری کو عرصہ تک سب سے چھپائے رکھا تھا، بلکہ خود کو بھی دھوکا دیتا رہا تھا کہ 'مجھے کچھ نہیں ہے' — کس موقع پر میں نے کیا کہا تھا۔ مثلاً یہ کہ ابھی دو ماہ پہلے مجھے کسی نے ایک شعر پڑھتے سنا تھا جو کچھ اس مفہوم کا تھا کہ "مرنے کے دن قریب ہیں---"

میں نے کہا "تجھ سے تو میری یادداشت بہتر ہے۔ وہ دن بھول گیا جب بیس سال پہلے پہلی بار ہوائی جہاز کی سیڑھیاں چڑھنے کے وقت میں نے کہا تھا 'شاید آج میرا آخری وقت آ پہنچا ہے'۔ بچہ، دو ماہ پہلے کی بات یاد رکھنا کون سی بڑی بات ہے بیس سال پہلے کی کہو تو جانیں!"

اور بہت سی آخری چند ہفتوں کی باتیں تھیں جنہیں وہ لوگ دھرا رہے تھے۔ مثلاً آپریشن کے بارے میں میرا یہ کہنا "فضول ہے۔ چھوڑو جی"۔ دراصل میں اس ہسپتال کے ماحول سے تنگ آ چکا تھا اور جانتا تھا ایک بار آپریشن کی زد میں اگر آگیا تو پھر ہفتوں اسی تاریک برآمدوں والے ہسپتال میں گذارنے ہونگے جس کے وارڈوں اور پرائیویٹ کمروں تک میں قبر سے زیادہ گھٹن ہے۔ اب اس کو کیا کہئیے؟ میری رائے کو فوراً سرجن نے مان لیا اور ہفتہ بھر بعد ہی یہ کہہ کر چھٹی دے دی "آپ چاہیں تو انہیں یہاں رکھیں، چاہے گھر لیجائیں۔ رہا آرام تو وہ ظاہر ہے انہیں گھر پر زیادہ ملے گا"۔

"اور آپریشن؟" میرے گھر والوں میں سے کسی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

سرجن تھوڑی دیر کے بعد جیسے مصنوعی سوچ کے اتھاہ ساگر سے ڈبکی لگاکر باہر نکلا اور بولا "اس کے میں پہلے بھی زیادہ حق میں نہیں تھا۔ کوئی بات ہوتو آپ مجھے فون کرسکتے ہیں۔ ویسے میں خود بھی کوشش کرونگا کہ کبھی کبھی انہیں دیکھنے آتا رہوں"۔

پھر اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا وہ مجھے اس شرط پر گھر دیکھنے آئیگا کہ فیس نہ دی جائے۔

اس کے جانے کے بعد میں ہنس پڑا۔

اسی ہنسی کی ریل باہر کے کمرے میں چل رہی تھی۔ اور بڑھیا دوسرے کسی کمرے میں عورتوں کو بتارہی تھی

"اس نے خود ڈاکٹر کو آپریشن سے منع کیا کہ کیا ضرورت ہے اور جب ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو ہنس پڑا۔ لوگ اسے مکے اور مدینے کی تصویریں دکھا رہے تھے تو

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا — تھا اب کون انہیں سمجھاتا کہ وہ موت کے فرشتے کو دیکھ رہا ہے کہ دیر کیوں لگ رہی ہے"۔

میں نے ایک بار پھر کہا "سُسری تو بڑی حرافہ ہے۔ میں موت کے فرشتے کی راہ دیکھ رہا تھا؟"

یہ آنکھیں اِدھر اُدھر گھمانے کی حرکت میں نے صرف اس وقت کی تھی جب میری بیوی غم سے نڈھال ہو کر کہیں اور چلی گئی تھی اور میں چاہتا تھا کہ وہ آجائے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے ایک بار پھر سے تسکین دوں "کیوں روتی ہو۔ کسی غیر کے گھر جارہا ہوں؟"

وقفے وقفے سے کسی کی آمد کا اعلان ہوتا تھا — پھر میرے کمرے کا دروازہ کھلتا تھا اور چادر ہٹاکر میری رونمائی کی جاتی تھی۔ ایسے لمحوں میں میرے بال ہوا میں اڑنے لگتے تھے۔ ان میں سے کچھ دور کھڑے ہوکر منہ ہی منہ میں فاتحہ پڑھکر وہاں سے رخصت ہوجاتے تھے کچھ کا گرم ہاتھ مجھے اپنے ٹھنڈے ماتھے پر بھلا لگتا تھا۔ میرے پلنگ کے نیچے اور چاروں طرف برف کی سلیں رکھی ہوئی تھیں جن سے کمرہ میرے لئے ڈیپ فریزر بن چکا تھا۔ میں کہنا چاہتا تھا

اُس وقت جو جی چاہے کرلو، کل کیا کرو گے؟ یا یہ کہ قبر کو بھی ڈیپ فریزر بنوانے کا ارادہ ہے؟'

رات بھر چائے کی پیالیاں کھنکتی رہیں اور اور گھر بیک وقت روشنی اور خاموشی کی لپیٹ میں رہا تا آنکہ صبحدم اذانیں گونجنے لگیں۔

اس کے گھنٹے دو گھنٹے بعد مجھے اٹھاکر صحن میں

Scanned by CamScanner

لیجایا گیا۔ جب میرے کپڑے اتارے جانے لگے تو میں سمجھ گیا اب اگلا سیکوئینس کیا ہے: چادر کے نیچے غسل اور کفن پہنانا۔ اور ایک بار پھر میں نے اپنے دماغ کی خودکو داد اس وقت دی جب ہلکا گرم پانی میرے جسم پر پڑنا شروع ہوا۔

نہلانے والا اپنی دانست میں نہایت آہستہ آہستہ ملائمیت سے میرے جسم کو مل رہا تھا لیکن اس کے ہاتھ کھردرے تھے۔ پانی ڈالنے والا کلمہ پڑھ رہا تھا جو خود مجھے بھی یاد تھا۔

کفن پہنانے کے بعد دو چار پھائیں پھائیں کرتے ہوئے آدمی مجھے اٹھاکر مسجد سے مستعارلی ہوئی چارپائی پر لٹانے کیلئے لے چلے اور مجھے چٹائی پر لیٹنا اچھّا لگا۔ یہ جگہ غالباً گھر کے باہر زمین کا وہ بے برگ و گیاہ ٹکڑا تھا جو ہمیشہ پیڑوں کی چھاؤں میں رہتا تھا۔

لوگ اب بھی میرے بھائیوں کا انتظار کر رہے تھے اور پہلے کچھ دیر تک مجھے گھیرے رکھنے کے بعد ٹولیوں میں بٹ گئے۔

رات والی فلم غالباً اتنی بار پروجیکٹر کے ایک اسپول سے دوسرے پر اور واپس پہلے پر لپیٹی گئی تھی کہ اب اس میں مزید دکھائے جانے کا دم نہیں رہا تھا۔

آنے والوں میں سے کوئی کوئی چھپ کر سگریٹ بھی پی رہا تھا۔ ایک صاحب اپنے بچے کے وزن نہ بڑھنے کا رونا رو رہے تھے۔ ایک ٹولی میں کوئی زور زور سے باقی لوگوں کو ایل۔ سی۔ (لیٹر آف کریڈٹ) کھولنے کی مشکلات بتا رہا تھا اور یہ کہ نئی امپورٹ پالیسی کے تحت کیا منگایا جا سکتا ہے اور کیا نہیں

"جب لائیسینس ہی نہیں دئیے جارہے ہیں تو ایل۔سی۔ کیسے کھولے جاسکتے ہیں! امپورٹ پالیسی بدل گئی ہے"۔

میں اس آدمی کو جانتا تھا اور یہ سوچ کر میں ہنس پڑا کہ جس جسامت کا وہ ہے اس کے لحاظ سے اس وقت اسے میری جگہہ اس ڈولی نما پلنگ پر لیٹا ہونا چاہئیے تھا اور اس حالت میں شاید میں بھیں کہیں اور کھڑا ہو کر اس تمام منظر کو بیزاری سے دیکھہ رہا ہوتا۔

اس کے بعد کسی نے یہ خبر ہر ڈولی کے پاس جاکر دبے الفاظ میں سنائی کہ دونوں بھائی نہیں پہنچ سکونگے۔ مجھے خیال آیا اندر وہ بڑھیا جب یہ خبر سنے گی تو کہے گی "ناحق اتنی دیر کی۔ رات بھر میں چار سلّیاں تو برف گھل گیا اور مردے کو علیحدہ تکیف ہوتی رہی"

اس کی بیٹی نے پوچھا ہوگا "اچھی امّی وہ کیسے؟"

اور بڑھیا نے کہا ہو گا "مردہ بول نہیں سکتا، سنتا اور دیکھتا سب کچھہ ہے۔ اسی لئے میت پر بین کرنے کو بھی برا کہا گیا ہے اور عورتوں کے قبرستان میں جانے کو بھی"

اس اعلان کے بعد مردوں میں سے کسی نے کہا "پھر دیر کس بات کی ہے؟ جنازے کی نماز کا کہاں انتظام کیا گیا ہے؟"

"تین مینار کی مسجد میں"

"تین مینار کی مسجد کیسی ہوتی ہے؟" انھی صاحب نے کہا

"جیسی اور سب مسجدیں ہوتی ہیں"

"اور سب مسجدیں چار مینار کی ہوتی ہیں" وہ صاحب بولے۔

میں کفن سرکا کر کہنا چاہتا تھا 'بہت سی بے مینار کی بھی ہوتی ہیں، ایک مینار کی بھی۔ کبھی کبھی صرف مینار ہوتا ہے مسجد نہیں ہوتی۔ میں نے ڈھائی اور پونے تین مینار کی مسجدیں تک دیکھی ہیں تم تین پر بدک رہے ہو۔ اصل میں اس کا چوتھا مینار ملک سے باہر جاچکا ہے اور اب واپس نہیں آئیگا۔ وہ چوتھا مینار یا تو اب تک کسی بینک میں انویسٹ ہوکر دو دونی چار، دولی آٹھ، دونی سولہ، دونی بتیس بن چکا ہے اور یا پھر خدا کی مرضی کے خلاف شیطان کو پیارا ہوا'۔

لیکن مسٹر سب کچھ، مسجد کے بعد اب دوسری تفصیلیں طے کرنے میں لگ گئے تھے "امام صاحب سے کہہ دیا گیا ہے؟۔۔۔ کون کہنے گیا تھا؟۔۔۔ خود انہوں نے کہہ دیا ہے کہ وہ وہاں موجود ہونگے؟۔۔۔ نماز مسجد کے صحن میں ہوگی یا باہر؟۔۔۔ باہر تو بہت کوڑا کرکٹ ہوتا ہے، بالعموم ہر مسجد کے باہر"۔

زمین کا تعین، قبر کی کھدائی، اوپر بچھانے کیلئے درختوں کی بلّیاں ہونگی یا سیمنٹ اور ریت کے سلیب؟

وہ بیک وقت ہر چیز کے بارے میں بوکھلائے ہوئے تھے جیسے مجھے نہیں انہیں وہاں دفن کیا جانے والا تھا۔

میں کہنا چاہتا تھا 'برادرم جب مجھے کسی قسم کی قبر میں دفن ہونے پر اعتراض نہیں ہے تو آپ اتنے متفکر کیوں ہیں'۔ پہلے میں انہیں اندر والی بڑھیا کے مقابل کا رتبہ دینے والا تھا لیکن ان میں بڑھیا والا وہ ٹھہراؤ نہیں تھا۔

ایک پیڑ کے نیچے میرا ایک دور کا بھتیجہ، جس کی ماں اسے بچپن میں چھوڑ کر مر گئی تھیں اور جسے غالباً

Scanned by CamScanner

کفن اور چٹائی اور پھولوں کی چادر وغیرہ خریدنے کیلئے گھر کے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ بھیجا گیا تھا، کوڑا ساری خرید و فروخت پر تبصرہ کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ سب سے سستی گلاب کے پھولوں کی چادر خریدی ہوتی جس میں پھول چھدرے ہوتے ہیں اور ایک روپئے، دو روپئے کی پھولوں کی پتّیاں لے لی جاتیں۔ چادر بچھاکر جب اوپر سے پتّیاں بکھیر دی جاتی ہیں تو بالکل ایسا ہی لگتا ہے جیسے پھولوں کی گھنیری چادر سے مٹی کے ڈھیر کو ڈھانپ دیا گیا ہے۔

وہ شکاری ہے اور ہر چیز کی قیمت کا تعیّن کارتوسوں کی تعداد سے کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی رائے میں جو پیسے بچتے اس سے کم سے کم تین کارتوس خریدے جاسکتے تھے — جو تین تیتر کے مساوی ہوتے۔ اور مرنے والے کو کونسا پتہ چلتا ہے کہ اس پر من بھر کی پھولوں کی چادر پڑی ہے یا من بھر پھولوں کی جھڑی ہوئی پتّیاں۔

'یہ ہے وہ شخص جس کی ملک کو ضرورت ہے' میں نے سوچا 'اور جسے خالصتاً اس ملک نے پیدا کیا ہے۔ اسی کا آٹا، اس کا خمیر اور گوندھنے والے ہاتھ ،ودیشی نہیں تھے۔ وہ یہیں بیلا گیا تھا، اور یہیں کی آگ پر پک اور سینک کر آج اس لائق ہوا تھا کہ جانتا تھا کس موقع پر کس روئیے اور عمل سے کام لینا چاہئے'۔

تھوڑی دیر بعد شور ہوا 'فوٹو گرافر آگیا'

وہ بس میں دھکّے کھاتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا اور ایسا لگتا تھا جتنی توجہ اور ھاتھا پائی سے اس نے اپنے رولی فلیکس کیمرے کی حفاظت کی تھی اگر اس کی نصف بھی اپنے جسم کی حفاظت پر صرف کرتا تو اس کا شمار اس وقت

Scanned by CamScanner

تعزیت کیلئے آنے والوں میں ہوتا کیونکہ اس کی آنکھوں میں کیمرے کو کھو بیٹھنے کا غم ہوتا۔

یہ آخری بات قدرے اہم ہے۔ اپنی زندگی کے دنوں میں میں نے اکثر دیکھا تھا لوگ کسی اپنی ہی بات پر مگن یا ملول ہیں لیکن اپنی اس خوشی یا غمی کو اس طرح صرفے میں لاتے ہیں کہ دوسرا اس سوشل بیوپار میں انکا مرہون منت ہو جائے۔ مجھے اس وقت افسوس ہو رہا تھا جہاں اور بہت سے کام کرنے سے رہ گئے ان میں سے ایک یہ مطالعہ بھی ہو سکتا تھا کہ 'جذبات کو دانستہ طور پر مصرف میں لانے کے معاشرے میں کیا طریقے رائج ہیں اور کس طرح ایک جذبے سے بیک وقت کئی کام لئیے جاتے ہیں'۔ مثلاً

ایک لڑکی جو خوبصورت اور گوری ہے باپ کے مرنے پر سیاہ دوپٹہ اس طرح اوڑھتی ہے کہ اس کا چہرہ زیادہ جاذب نظر بن جاتا ہے۔ ایسا کرنے میں وہ اپنے غم کے جذبے کو ایکسپلائیٹ کررہی ہے۔

بہرحال فوٹو گرافر مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے بال ادھڑے ہوئے تھے، قمیص کے بٹن غائب تھے اور وہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

گھر کی نوجوان پود میں سے کسی نے جو زیادہ دیر رونے دھونے کا ڈھنگ نہیں رچا سکتا تھا شرارت سے اس سے پوچھا

"فلم رنگین ہے یا کالی اور سفید؟"

"جو آپ کی شادی پر استعمال ہوئی تھی" فوٹوگرافر نے کیمرہ سر کے اوپر بلند کرتے ہوئے اس کے منی اسکرین پر میری الٹی تصویر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

میرا آدھا جسم دھوپ میں تھا، جو مجھے اچھی لگ رہی

Scanned by CamScanner

تھی، اور آدھا چھاؤں میں۔ اس لئیے پہلے ڈولی نما پلنگ کو سرکایا گیا

فوٹوگرافر ایک گملے کو الٹ کر اس پر کھڑا ہو گیا۔ اسنے اپنا سر مایوسی سے ہلاتے ہوئے کہا "اب چہرہ آدھا چھاؤں میں ہے آدھا دھوپ میں"۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" مسٹر سب کچھ نے کہا

"دھوپ والا حصہ سپاٹ ہوجائیگا" فوٹوگرافر نے کہا

"چہرہ فانی چیز ہے۔ اس کے سپاٹ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے" مسٹر سب کچھ نے کہا

"تصویر بھی فانی چیز ہے۔ کھنچوانے سے کیا فرق پڑتا ہے" فوٹوگرافر نے چڑھ کر کہا۔

اب مشکل یہ آ پڑی وہ ہمیشہ سے چہروں کو خود فریم میں سیٹ کرنے کا عادی تھا۔ ایک اچھا فوٹوگرافک فریم ایک پینٹنگ کے ہم پلہ ہوتا ہے اور اس کیلئے ٹھوڑی کو، سر کو اور کنپٹیوں کو بار بار چھو کر ہلکی سی جنبش دینا پڑتی ہے۔ لیکن وہ مجھے چھوتے ہوئے کترا رہا تھا۔ جس طرح اور سب مرے ہوؤں کو چھوتے ہوئے کتراتے ہیں۔ اسی لئیے وہ دوسروں سے کہتا تھا

"تھوڑا سا چہرہ اور کھولئے۔ ان کے ہونٹ پورے آئیں، داہنی آنکھ پوری اور تھوڑا سا الٹی آنکھ کا باہر کا حصہ۔ ٹھوڑی اٹھائیے۔ سر پیچھے کو۔۔"

یہ عمل کئی بار دھرایا گیا۔ آخری تصویر گھر کے اندر لی جانی تھی جس کیلئے لوگ دوبارہ ڈنڈا ڈولی کر کے مجھے گھر کے اندر کے برآمدے میں لٹا آئے۔ اس کے بعد میرے چاروں طرف عورتوں کا جمگھٹا لگ گیا جو رو بھی رہی تھیں اور میرے اوصاف بھی بیان کر رہی تھیں۔ رات والی فلم کو گویا دوبارہ کچھ وقفے کے بعد ریلیز کیا گیا تھا اور اس مہلت نے آنکھوں کو اشکباری کیلئے پھر سے تیار کردیا تھا۔

Scanned by CamScanner

حالانکہ میں لوگوں کی اپنی موت سے متعلق رائے سے متفق نہیں تھا کہ کیا بے وقت ہوئی ہے، ناگہانی موت اسی کو کہتے ہیں، لیکن مجھے ایک بات کی، خوشی ہوئی کہ بے وقت اور قبل از وقت والے جملے مہمل سہی، کم از کم میری موت پس از وقت نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ بڑھیا شاید اس وقت دل ہی دل میں کہہ رہی ہوتی 'مرکے ہی نہیں دیتا تھا۔ آخرت کے بورئیے سمیٹنے کو بیٹھا تھا'۔

حقیقت میں مرنے کا وقت گذر جانے پر مرنے کو میں اپنی موت تسلیم کرتا۔

پھر بھیڑ کائی کی طرح پھٹنی شروع ہوئی اور کچھ عورتیں میری گرتی پڑتی بیوی کو سنبھالے ہوئے میرے دائیں پہلو کی طرف لائیں جدھر میرا سر اپنے آخری پوز کیلئے فوٹوگرافر نے ایک خاص زاوئیے بلکہ یوں کہنا چاہئیے مختلف زاویوں میں رکھ رکھا تھا۔

وہ پہلے تو مجھے نہیں دیکھنا چاہ رہی تھی اور غم سے نڈھال تھی لیکن جب عورتوں نے کہا 'اسے اس کے شوہر کا چہرہ دکھاؤ نہیں تو صدمے سے مرجائیگی' تو بہت سی عورتوں نے اس کا چہرہ زبردستی اوپر اٹھایا اور منت بھرے لہجے میں کہنے لگیں — "بہو! بیٹی! بھابھی! آپا! بہن! آنکھیں کھولو"

لیکن جب وہ آنکھیں کھولنے پر آپے سے باہر ہوکر مجھ پر جیسے ٹوٹ پڑی تو سب اسے پیچھے کی طرف دھکا دینے لگیں۔ "نہیں، نہیں یہ میت کی بے حرمتی ہے"۔

بڑھیا نے کہا "مرنے کے بعد شوہر بیوی کیلئے اور بیوی شوہر کیلئے نامحرم ہوجاتے ہیں"۔

اس کی لڑکی نے پوچھا "اچھی اماں وہ کیسے؟ اتنے سالوں ساتھ رہنے کے بعد بھی"

بڑھیا نے کہا "ہاں اتنے سالوں ساتھ رہنے کے بعد بھی۔ بیوی مرجائے تو شوہر کیلئے اس کا چہرہ دیکھنا بھی منع ہے"۔

بیوی کے سین سے غائب کرد ئیے جانے کے بعد حقیقت میں میرا آخری سفر شروع ہوا۔ جس طرح ہر میت میں ہوا کرتا ہے۔ بین و بکا کندھے بدلنا، لوگ کلمۂ شہادت پڑھ رہے تھے اور اکا دکا مخالف سمت سے آنے ہوئے بائیسکل سوار جنازے کے پاس پہنچ جانے پر ادب سے اپنی جگہہ پر لمحہ بھر کو کھڑے ہوجاتے تھے۔ مشکل ان کی تھی جو اس سمت جارہے تھے جدھر جنازہ جارہا تھا۔ وہ بائیسکل سے اترتے تھے۔ دو چار قدم تیز تیز چلتے ہوئے اس چھوٹے سے جلوس سے آگے نکل جاتے تھے اور پھر بائیسکل پر سوارہوکر پھرتی سے آگے کے ٹریفک میں مدغم ہوجاتے تھے۔

کارتوسوں والا رشتے کا بھتیجہ سگریٹ پی رہا تھا جسے وہ کش لگاکر اپنے پیچھے چھپا لیتا تھا جیسے دونوں ہاتھ اس نے اپنی پشت کے نیچے باندھ رکھے ہوں۔ وہ کندھا دینے کی باری بھگتا چکا تھا۔

لوگوں میں غم اور مذہب اور کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ کے تند جذبات کا ایک اُبھار سا آتا تھا۔ وہ ایک فوری اسٹریوٹائیپڈ ردِعمل سے گذرنے کے بعد آہستہ آہستہ جنازے کی پچھلی صفوں میں پہنچ جاتے تھے اور زندگی کی ڈور کو وہیں سے دوبارہ پکڑ لیتے تھے جہاں گھڑی بھر پہلے انہوں نے اسے چھوڑا ہوتا تھا

تا آنکہ مجھے مسجد کے صحن میں لیجایا گیا۔ وہاں کچھ بچے اپنے سامنے رحلوں پر قرآن شریف رکھے ٹھنڈے دالان میں سنگ مرمر کے فرش پر بیٹھے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے

کچھ سُوشگافیوں کے بعد پلنگ نُما ڈولی کو بیچ صحن سے اٹھاکر سید ھے ہاتھ کی طرف لیجایا گیا۔ یہ جگہ نہ صحن تھی، نہ دالان، نہ مسجد کا اندرونی حصہ اور جیسا کہ میرے علم میں تھا بعد میں یہاں مسجد کے منتظمین کا ارادہ دوکانیں بنانے کا تھا۔

لیکن جس طرح ایک جنرل اپنا پلان بار بار بدلتا رہتا ہے کہ دشمن نہ بھانپ سکے کہ بالآخر کہاں ٹکراؤ ہوگا امام صاحب بھی اپنے پلان کو مجھ پر آشکارہ نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن میں ان کے دماغ کی ساخت کو جانتا تھا اور کفن میں پیر پھیلائے سکون سے لیٹا تھا۔

مجھے وہاں لے جایا گیا جہاں وضو کیلئے ایک لائین میں نلکے لگے ہیں اور ان کے آگے ایک لمبا برآمدہ صحن کے خاتمے پر ہے اور

پھر وہاں سے مسجد کے دروازے کے باہر سڑک پر،
اس کے بعد ــــ

ایک نوجوان نے پسینہ پونچھتے ہوئے جھلاّہٹ سے کہا "پہلے امام صاحب کو ایک بار فیصلہ کرلینے دو کہ نماز ہوگی کہاں"

اس جملے کے جواب میں سب خاموش رہے جس کا مطلب تھا کہ امام صاحب کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت اب سرعام پرکھی جارہی تھی اور لوگوں کو اور مجھے بھگانے دوڑانے میں جس تحکم کو وہ اب تک برت رہے تھے اس کا وقت ختم ہوچکا تھا۔ یوں بھی دیکھا جائے تو ان کا رول اب چند منٹوں کا باقی تھا۔

انہوں نے مسجد کے باہر سڑک کے پار بنے ہوئے ایک احاطے میں جہاں غالباً گائیں بھینسیں باندھی جاتی تھیں ایک جگہ کا انتخاب کیا۔ یہاں میرے پلنگ کے عین نیچے اونٹوں

اور بکریوں کی مینگنیاں تھیں اور خود جہاں امام صاحب کھڑے تھے اس کے پاس ہی سوکھے ہوئے گوبر کی روڑیاں سی پڑی رہ گئی تھیں جو غالباً ان لڑکیوں کی دست رس سے بچا رہ گیا تھا جو گائیوں بھینسوں کے پیچھے پیچھے اتنی دور تک دوڑتی ہیں جتنی دور تک وہ ان کے محلے سے گذر رہی ہوتی ہیں اور بھاگ بھاگ کر گوبر اٹھاتی جاتی ہیں "اور اگر ان کا بس چلے تو ہاتھ ڈال کر ــــ"

یہ بات بھی وہ ہے جسے میری بیوی نے کم سے کم بچوں کے سامنے مجھے کبھی پورا کرنے کا موقع نہیں دیا ــ لیکن بچے سمجھ جاتے تھے کہ گوبر بٹورنے والی لڑکیوں کا اگر بس چلے تو وہ کیا کریں اور کھلکھلا کر اپنی ماں کے سامنے ہنس پڑتے تھے جیسے چڑھانے کیلئے، کہ ہم سمجھ چکے ہیں ــ

تو بات یوں تھی کہ ہر طرف سناٹا تھا ــ اس احاطے میں مجھے اس طرح لٹایا گیا تھاکہ اگر میں چادر پھینک پھانک کر ایک دم اٹھ بیٹھتا تو میرا چہرہ قبلے کی طرف ہوتا بشرطیکہ میں اس عمل میں ٹانگوں کو بھی گھٹنوں پر سے موڑکر پیچھے کی طرف لیجاتا لیکن فی الوقت میرے پیر قبلے کی طرف تھے ــ اس پر بحث ہوئی اور صفوں کی تعداد پر بھی کہ کتنی ہونی چاھئیں ــ

کچھ لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور ایک دم صف میں شامل ہوکر جوتے اتارکر ان پر کھڑے ہوگئے ــ یہ میں بھی بارہا کرچکا تھا ــ مجھے معلوم تھا بہت سے بے وضو ہیں اور اب ہر اللہ اکبر پر گڑبڑا جائینگے کہ کیاکرنا ہے ــ میں ان میں سے اکثر کو جانتا تھا ــ جو چند افراد نماز سے ہٹ کر ٹوٹی ہوئی باؤنڈری کی دیوار پر بیٹھے تھے دوسرے فرقوں یا

دوسرے مذاہب کے تھے اور بڑی دلچسپی سے نماز کو دیکھ رہے تھے۔

میں قدرے خجل تھا۔ اگر میری نماز جنازہ ایسی ہی جگہ پر ہونی تھی تو ان لوگوں کو نہ بلایا ہوتا۔ اپنوں سے کوئی پردہ نہیں تھا آن سب کو بھی اسی طرح مرنے کے بعد اِدھر آدھر لئیے لئیے پھرا جائیگا اور پھر اکثر کی نماز جنازہ عین سڑک پر ہوگی جہاں گھوڑں کی لید اور پیشاب ہوگا۔

مسجد کے صحن کے ایک گوشے میں جن کی آخری نماز ہوگی انہیں مرنے کے بعد بھی مراعات یافتہ سمجھنا چاھئیے۔

اس کام کے ختم ہوجانے کے بعد کچھ نمازی میرے لڑکے کی نظروں میں آنا چاہ رہے تھے اور اس کیلئے بے وجہ انہیں اسے تسکین دینے کیلئے بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ مجھ سے زیادہ یہ لڑکا ان کے کام آسکتا تھا اور شاید تیجے کے بعد ہی اسے اپنی پوسٹ پر واپس جانا تھا۔

اگلا سیکوئینس میرے ذھن میں تھا۔ آخری سفر کا دوسرا حصہ جسے مزید تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا تھا

الف: اس گوبر اور مینگنیوں کی جگہ سے کرائیے پر لی ہوئی میّت بردار گاڑی تک کا مرحلہ، کلمۂ شہادت کے نعرے، کندھوں کا بدلا جانا جس میں بار بار مجھے جھٹکے سہنے پڑینگے، دوکانداروں کا اپنا کام چھوڑکر باہر آجاناکہ کون لیجایا جارھا ہے۔ سڑک کے بچوں کا میّت کے پیچھے پیچھے دوڑنا اور فقیرنیوں فقیروں کا موقع سے فائدہ

اٹھاتا کیونکہ ان کی یہ دعائیں جو بلا معاوضہ نہیں تھیں ،مجھے جنت میں پہنچا سکتی تھیں۔

ب: بس کا سفر

پ: قبرستان میں اس قافلے کی آمد اور وہاں سے روانگی۔

بس میں سوار کراتے وقت میں نے کسی کو پوچھتے سنا "سویم کی اطلاع اخباروں میں چھپوا دی گئی ہے؟"

کسی نے تلخی سے جواب دیا "آپ نے آج کا اخبار نہیں دیکھا؟ اس میں تدفین کی اطلاع موجود ہے"۔

سوال کرنے والے نے کہا "بھائی اس اندوھناک خبر کو سن کر مجھے کل سے کھانے پینے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ آج کا اخبار کیا دیکھتا۔ بہرحال 'صدمے ہیں یہ آدمی کے واسطے'۔ جب تک زندہ ہوں مرحوم کی تصویر سال بہ سال اسی شعر کے ساتھ کل کی تاریخ پر اردو انگریزی دونوں اخباروں میں چھپتی رہے گی"۔

"سب اخباروں میں؟" تلخ لہجے والے نے زیادہ تلخی سے پوچھا۔

"جو دو میرے گھر آتے ہیں میں تو انہی دو اخباروں کو جانتا ہوں"

میں نے اپنے دل میں اسے گالی دی۔ سسرا کسی بڑے ڈائریکٹر کے ہتھے چڑھ گیا ہوتا تو آج کو تھیسپئین ہوتا۔ اب اپنی اداکاری کی صلاحیتیں پرسوں تعزیتوں میں لٹاتا پھرتا ہے۔

ایک بار پھر جھگڑا ہوا بس کے اندر میرا سر ڈرائیور کی سمت رہیگا یا پیچھے کھلنے والے دروازے کی طرف۔ جہاں اس وقت بس کھڑی تھی اس لحاظ سے میری ٹانگیں

Scanned by CamScanner

ڈرائیور کی طرف ہونی چاہئیے تھیں۔ لیکن بس کا وہی رخ برقرار رکھنے میں ہم کہیں کے کہیں نکل جاتے۔

مسٹر سب کچھ نے کہا "جس طرح ٹرین میں نماز پڑھنے کیلئے سمت کی قید نہیں ہے اسی طرح میت کو لیجانے میں بھی نہیں ہے"۔ پھر انہوں نے کچھ سوچ کر پوچھا "مگر قبر تو کُھد چکی ہے نا؟"

"جی ہاں، جی ہاں، کُھد چکی ہے۔ آپ بیٹھئیے" میرے عزیزوں میں سے کسی نے کہا۔

"انھوں نے کہا "نہیں میں کار سے آرہا ہوں۔ دراصل بس کا ڈیزل میرے دماغ کو چڑھ جاتا ہے"۔

اس طرح کچھ لوگ کاروں میں پیچھے پیچھے چلے اور کچھ بس میں میرے چاروں طرف بیٹھے تھے۔ شروع میں کلمہ بہت باقاعدگی سے زور زور سے پڑھا جارہا تھا، کچھ خاموشی سے رو بھی رہے تھے۔ لیکن چونکہ سفر لمبا تھا اس لئیے پہلے کلمہ زیرلب ہوا، اور پھر کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگ گئے۔

"یہ فلیٹس کب بننے شروع ہوئے؟"

"ادھر کا تو پورا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ آخری دفعہ میں پھوپھی مرحومہ کے انتقال کے بعد اس طرف آیا تھا۔ اُس بات کو بھی دس بارہ سال ہو چکے ہیں"۔

"دس بارہ سال میں تو صاحب دنیا بدل چکی ہے، امریکی ویت نام سے جا چکے ہیں اور وہاں کے کھنڈر تک دوبارہ شہر بنگئے ہیں۔ آپ یہاں کی بات کر رہے ہیں"۔

میرا لڑکا ایک طرف خاموشی سے بیٹھا رو رہا تھا لیکن اس کے رونے میں آواز نہیں تھی۔ پھر اس نے جیب سے یٰسین شریف کی سنہری کاپی نکالی، اسے پڑھنے کی کوشش

گ.ی لیکن ایسا لگتا تھا اس کا دماغ کہیں اور تھا۔
اس نے جلد ہی دوبارہ پنسین جیب میں رکھ لی، اور آنسو
خشک کرنے لگا۔

اس قسم کا رونا جس میں بین نہ ہو، سسکیاں نہ
ہوں، آواز نہ ہو سب سے خطرناک ہوتا ہے اور رونے والا
اس میں غم کے پہاڑ جیسے بوجھ کو اپنے کندھے پر لادے خاموشی
سے اپنی راہ چلتا رہتا ہے۔

سڑک کے موڑ اور دھچکوں سے میں اس وقت وہ کھیل کھیل
رہا تھا جو کبھی ہم بچپن میں کھیلا کرتے تھے
'بتاؤ اب کہاں ہیں؟'

اور اگر میں اٹھکر بیٹھ سکتا تو یقیناً میرا اندازہ درست
ثابت ہوتا کیونکہ اپنا امتحان میں اس طرح بھی لے سکتا تھا
اگر یہ وہ جگہ ہے جہاں پے بہ پے تین جھٹکے آتے ہیں اور
سڑک کے کنارے لوگ اکڑوں بیٹھے پیشاب کر رہے ہوتے ہیں تو
تھوڑی دیر میں ربڑی والوں کی دوکانوں کو آنا چاہئیے جہاں
پورے محلے کو جاگتا رکھنے کیلئے لاؤڈ اسپیکرز موسیقی کی
موجودہ پسند پورے زور سے اگل رہے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد
بس کو ٹھیرنا ہوگا یا بریکس لگائے جائینگے۔۔ ٹھیرنا اس بات
کی علامت ہوگی کہ چوراہے پر سپاہی موجود ہے، بریکس
اس بات کی کہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے بھی میں ایکسیڈینٹ
سے بال بال بچا ہوں۔

اور میں ہر بار ٹھیک ثابت ہوا۔

دو ایک بار جب کفن کے اوپر کی چادر ہوا سے میرے
سر یا پیروں پر پھڑپھڑانے لگی تو میرا لڑکا خاموشی سے
اٹھکر میرے پاس تک آیا۔ اس نے چادر چٹائی کے نیچے

اڑسی، میرے پیر تھامے یا لحظہ بھرکو میرے ماتھے پر ھاتھ رکھا جیسے چاھتا ھو میں اسے سینے سے لگالوں۔

قبرستان کا سواد آچکا تھا جب میرے لڑکے کو ایک صاحب نے اپنے پاس بیٹھنے کیلئے کہا۔ وہ کفن پوش درست کرکے ان کے پاس بیٹھ گیا۔

انہوں نے کہا "بیٹا باپ تو اب تمہارے آنہیں سکتے اور نہ باپ کا نعم البدل ھوسکتا ھے۔ اور تمہارے باپ! جتنا رؤو کم ھے۔ لیکن اب تم ہی گھر کے بڑے ھو۔ ماں اور بہن بھائیوں کے سامنے رؤگے تو وہ اور دل شکستہ ھونگے"۔

میرے لڑکے کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

انہوں نے اس کی پیٹھ پر ھاتھ رکھ کر کہا "باپ تو چلے گئے لیکن اپنے اس چچا کو مت بھول جانا۔ ان کے مرجانے سے میرا ان کا ساتھ ختم ھوگیا ھے، دوستی ختم نہیں ھوئی"۔

لڑکے نے ان کی طرف غور سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رھا ھو۔ پھر بولا: آپ فلاں چچا ہیں۔

انہوں نے کہا "ھاں اور اس وقت کے اور آج رات کے کھانے کا انتظام تمہاری چچی کررھی ہیں"۔

اونچی نیچی زمین کی وجہ سے بس نے ہچکولے کھائے اور تھوڑی دور چل کر کھڑی ھوگئی۔ ھمارے پیچھے کی دھول جب پھٹی تو اس میں سے کاریں نمودار ھونی شروع ھوئیں۔ کچھ لوگ سائیکلوں پر تھے اور اکّا دکّا پیدل جو میل بھر دور کے پبلک بس اسٹاپ پر اترے ھونگے۔

مجھے بس سے نیچے اتارلیا گیا اور وہی سین شروع ھوا

جسے میں بارہا دیکھ چکا ہوں۔ میرے لئیے اس میں کچھ بھی تو نیا نہیں تھا۔ بھونکتے ہوئے کتے، آس پاس کے کچّے اور نیم پختہ مکانوں کے ننگ دھڑنگ بچے، وہ لڑکے جو بالٹیوں میں پانی بھر بھر کر لارہے تھے کہ کس قبر پر پانی چھڑکوانا ہے، اگر بتی، ماچس اور پھولوں کی چھوٹی سی دوکان، قبروں پر پڑا ہوا پخانہ، بیٹھی ہوئی قبریں، ٹیڑھی قبریں، وہ جنہوں نے منہ کھول رکھے تھے اور وہ جو جھاڑیوں سے چھپ گئی تھیں۔۔۔

لوگوں کو نہیں معلوم تھا مجھے کہاں ایجایا جانا ہے کیونکہ قبروں کے بیچ میں چھوڑی ہوئی بٹیاں بھول بھلیّاں تھیں اور اکثر جگہ مٹی ہوئی بچوں کی قبروں پر سے ہوکر گذرتی تھیں۔

ایک ہراول دستے نے چلاکر کہا "اُدھر نہیں، اِدھر۔ اس طرف سے"

دھوپ تیز ہوچکی تھی اس لئیے لوگ اس تمام کارروائی سے تنگ آ چکے تھے۔ کلمہ پڑھتے رہنا ان کیلئے دوبھر تھا۔ دو ایک اپنے پیر میں سے ببول کا کانٹا نکالنے کو کسی قبر پر بیٹھ گئے اور اسی بہانے تھوڑا سستا بھی لئے۔

جب جنازہ تازہ کھدی ہوئی قبر کے پاس رکھدیا گیا تو آخری کندھا دینے والے رومالوں سے اپنی گردنوں کا پسینہ پونچھنے لگے باقی درختوں کی چھاؤں میں اِدھر اُدھر تصویر غم بنے بیٹھے یا کھڑے تھے۔ میں نے ایک کو اپنے ساتھی سے فریاد کرتے سنا "صبح صرف ایک پیالی چائے پی کر نکلا ہوں اور یہ وقت ہو رہا ہے"۔

یہ وقفہ ایک لحاظ سے آخری حملے سے پہلے کا آرام تھا کیونکہ اس کے فوراً بعد سب کو مستعد ہوکر آخری معرکہ انجام دینا تھا۔

Scanned by CamScanner

مجھے حضرت موسیٰ کا خیال آیا جنہیں فرشتوں نے ان کے تھپڑ سے ڈر کر قبر میں یہ کہہ کر لٹایا تھا 'آپ کے ہی جثّے کا ایک شخص مر گیا ہے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں قبر اسے پوری بھی پڑے گی یا نہیں'

اور حضرت موسیٰ نے جو شاید موت کے تصوّر کے خلاف تھے ـــ کم سے کم نبیوں کے قصّوں کے مطالعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے ـــ اس میں لیٹ کر کہا 'کتنی آرام دہ قبر ہے'۔ پھر انہیں ایک پھول سونگھنے کیلئے دیا گیا جسے انہوں نے سونگھا ـــ اس وقت میرے اوپر املتاس Acacia کے پیلے پھول پیڑ سے جھڑ کر گر رہے تھے اور اس کیلئے میں دل سے اس پیڑ اور ہوا کا ممنون تھا کیونکہ دونوں بغیر کسی کی نگاہ میں آنے کی تمنّا کے یہ ورشا مجھ پر کر رہے تھے۔

قبر کھودنے والا جو اپنے قد کے لحاظ سے کہیں زیادہ وزنی تھا اور جس کی سیاہ پنڈلیوں پر خون کی نالیوں کا جال تھا قبر کے اندر اترا اسے آخری ٹچیز touches دے رہا تھا۔ ایک دو ہاتھ پھاوڑے کے اس دیوار پر، پیروں سے فرش کو اِدھر اُدھر دھپدھپانا۔ پھر وہ باہر نکل آیا۔ مٹی اس کی کہنیوں اور چہرے پر لگی ہوئی تھی۔

کسی نے سر کے اشارے سے پوچھا "ہوجائیے"

اسنے منہ سے کہا "بسم اللہ سائیں"

"ٹھیک ناپ سے کھودی ہے نا؟ چھوٹی تو نہیں پڑے گی؟" مسٹر سب کچھ نے کہا۔

"جی سائیں" قبر کھودنے والے نے کہا

کارتوسوں والے رشتے کے بھتیجے نے آواز بدل کر کہا

Scanned by CamScanner

"نہیں سائیں ساتھ میں آپ کے آرام کرنے کیلئے بھی جگہ چھوڑی گئی ہے"

مسٹر سب کچھ نے ایسا ظاہر کیا گویا یہ جملہ انہوں نے سُنا ہی نہیں ہے۔

جنہوں نے سُن لیا تھا انہوں نے آتی ہوئی ہنسی کو مصنوعی غُصّے میں بدل دیا۔

زیادہ تر لوگ قبر کے نزدیک آگئے۔۔ اس پر مشورے دئیے گئے قبر کے اندر پہلے سے کون دو آدمی اترینگے یعنی کون کون میرا وزن سہار سکتا تھا۔

مجھے پہلی بار آہستگی سے ڈولی نما پلنگ سے اٹھالیا گیا اور اب وہ میری نہیں رہی تھی۔ اٹھانے والے قبر کے ایک طرف کے ٹیلے پر چڑھے۔ مسٹر سب کچھ اور دو ایک زیادہ جاننے والے حضرات برابر مشورہ اور ردِ مشورہ دیتے رہے۔ چٹائی نیچے بچھائی جائیگی یا سیمینٹ سلیبس کے اوپر۔

دو چادروں کی سلنگ بناکر مجھے جب نیچے اس طرح اتارا جارہا تھا جس طرح شاید انسان نے سب سے پہلے کرین کا استعمال کرنا سیکھا ہوگا تو ایک خوف نے مجھے آن دبوچا:

مان لو اگر اس مسخرے کا سوال درست تھا کہ قبر چھوٹی تو نہیں پڑے گی۔ تو؟

اگر قبر واقعی چھوٹی پڑگئی تو خیر مجھے تو دوبارہ نکالا جائیگا جو میرے نزدیک کچھ اچھا شگون نہیں تھا، اور میرے گھٹنے سکیڑکر یا گردن موڑکر یہ لوگ مجھے اسی طرح یہاں رہ پڑنے پر مجبور نہیں کرینگے۔ بلکہ قبر کو کشادہ کیا جائیگا۔ لیکن اس کے بعد جو چہ میگوئیاں ہونگی ان کی صفائی کون کرتا پھرے گا اور یہ لوگ میری بیوی اور بچوں کا جینا اجیرن کردینگے کہ مرحوم بیاجوے تھے۔

Scanned by CamScanner

یا یہ کہ کسی کے مکان یا کھیت کا کچھ حصہ میں نے اپنی زندگی میں دبایا ہوگا۔

اس قسم کے واقعات میں بچپن میں بارہا سُن چکا تھا۔ فلاں صاحب جو داڑھی والے تھے لیکن چُھپے چوری سُود پر روپیہ دیتے تھے جب انہیں قبر میں اتارا گیا تو حالانکہ قبر ناپ کر بنائی گئی تھی لیکن سُکڑ گئی — زمین انہیں لینے کو تیار نہیں تھی۔ ہر واقعے میں یہی ہوا تھا کہ تین دفعہ مَیّت کو قبر میں اتارا گیا، اور تینوں بار قبر چھوٹی پڑی۔ حالانکہ ہر بار اسے مزید کشادہ کردیا جاتا تھا۔

اب میں قبر میں کھڑے ہوئے دونوں مضبوط جسم کے نوجوانوں کے ہاتھوں پر تھا اور اپنے انجام پر غور کر رہا تھا۔ نہ میرے کھیت تھے نہ دوکانیں نہ میں نے کوئی مکان بنوایا تھا۔ رہا بیاج یا بیاض کا معاملہ تو بیاضیں تو میں نے بھی روپئیے کی بہت بنائی اور پھاڑی تھیں لیکن جس کسی نے کبھی روپیہ لیا تھا تو وہ اصل مع سود کے ہضم کر گیا تھا۔

لیکن میرا یہ خوف فوراً ہی ختم ہوگیا جب میرے جسم کے زمین پر ٹکتے ہی نیچے سے کراہنے کی آواز میں کسی نے کہا

"گھوڑا رے گھوڑا"

میں نے کہا "تم کون ہو؟"

بولا "تمہارا ساتھی"

میں نے اور کچھ پوچھنا چاہا۔ وہ بولا "اِن سے فارغ ہو لو ہماری تمہاری باتوں کو ایک عمر پڑی ہے"۔

کفن کی گرہیں کھول دی گئیں۔ اور فوٹوگرافر کے سے اہتمام کے ساتھ میرے چہرے کو صحیح پوز میں کردیا

گیا۔ مجھے نہیں معلوم قبر کے دونوں بازوؤں پر جمع ہوئی ہوئی مٹی کے ٹیلوں پر کھڑے ہوئے لوگوں کو میں کیسا لگ رہا تھا۔ مجھ پر گلاب کا پانی چھڑکا جارہا تھا اور آبِ زم زم۔ قبر میں کافور کی بُو تھی۔

پھر وہ دونوں اوپر چڑھ گئے اور جاتے ہوئے میرا چہرہ بھی ڈھکتے گئے۔

اب قبر پر سلیبیں رکھی جارہی تھیں اور اندر اندھیرا ہو چلا تھا جس طرح گرمیوں کی دوپہر میں لوگ اپنے سونے کے کمروں کو کرلیتے ہیں۔

شاید آخری دو، تین سلیبس باقی تھیں جب ایک ان پڑھ سے آدمی نے جو میرے پیروں کی طرف کھڑا تھا اپنے ساتھی سے کہا

"لو بس اب چھپ گئے"

مجھے وہ بہت ہی سیدھا سا اور معمولی حیثیت کا آدمی نظر آیا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ میری تدفین میں کیوں شریک تھا۔ ہوسکتا ہے میں نے کبھی اس کی مدد کی ہو۔ اس نے مجھ سے کوئی درخواست لکھوائی ہو یا اس کیلئے کسی معمولی قسم کی نوکری وغیرہ کی سفارش۔

لیکن ہم ہمیشہ اپنے اُن احسانات کو یاد رکھتے ہیں جو بڑی نوعیت کے ہوتے ہیں یا باحیثیت لوگوں پر کئے جاتے ہیں — معمولی قسم کے احسانات کو نہیں۔ کیونکہ اول الذکر سے ہمارے اپنے مفادات وابستہ ہوتے ہیں اور موخرالذکر جو کسی بے نام سے شخص کی زندگی میں انتہائی اہم ہوسکتے ہیں ہمیں یاد تک نہیں رہتے۔

میں اس آدمی کے بارے میں سوچتا رہا یہاں تک کہ قبر میں مکمل اندھیرا ہوگیا اور وہی چٹائی جس پر تھوڑی دیر

پہلے میں لیٹا تھا اب ان سلیبس پر بچھادی گئی اور لوگوں نے مٹھیاں بھر بھر کے اس پر قبر سے نکالی ہوئی مٹی ڈالنی شروع کردی۔ تھوڑی بہت ریت کی طرح باریک مٹی چٹائی میں سے چھن کر سلیبس کے بیچ کے رخنوں میں سے ہوکر میرے اُجلے کفن پر بھی گر رہی تھی اور پوری قبر میں وہی دھسک تھی جو آٹا پیسنے کی چکیوں اور پتھر کچلنے والی مشینوں کے آس پاس ہمیں اٹھتی محسوس ہوتی ہے۔

کچھ لوگ کھینچ کھانچ کر میرے لڑکے کو قبر کی پائنتی تک لائے اور اس سے کہا ”کلمہ پڑھ کر باپ کو مٹی دو“

وہ سسکیاں لے رہا تھا۔

اب میں اسے یہ کیسے سمجھاتا کپال کریا کرنے کی بپتا جن پر پڑتی ہے تمہاری وہ دشا تو نہیں ہے اور نہ ہی اس بیٹے کی سی جو جلانے کیلئے باپ کے جسم کو مشین کے حوالے کرنے جاتا ہے کیونکہ مرنے والے نے اپنی وصیت میں یہی لکھا چھوڑا ہوتا ہے۔

کچھ دیر تک سیمینٹ کی سِلوں پر مٹی کے گرنے کی آوازیں آتی رہیں پھر مٹی کو برابر کرنے کی اور ہاتھوں سے دھپ دھپ کرکے اسے ٹھوس، ہموار اور قبر کی شکل دینے کی۔ کچھ لوگوں نے اس کچی مٹی میں اگربتیاں اڑس دیں اور ایک لڑکا قبر پر پانی چھڑکنے لگا“

ایک آدمی چلّایا ”تم سے کس نے پانی چھڑکنے کو کہا تھا۔ ساری اگربتیاں گیلی ہوگئیں“

لڑکا بالٹی لئیے مایوس کھڑا تھا۔ اس آدمی نے اڑسی ہوئی اگربتیاں میرے سرہانے اور پائنتی سے اکھاڑیں اور

انہیں برابر کی جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اس کی قہر آلود نظریں دیکھ کر لڑکا وہاں سے چلتا ہوا۔ جیسے اپنی عجلت پر خود خجل ہو۔

سورج اس وقت اگر نیزہ گاڑھا جاتا تو بے سایہ ہوتا۔ میرے رشتے دار قبر پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے تھے اور چند آنے والوں نے اپنے بنڈل بھی ان کے حوالے کئیے جن میں میرا توشہ یعنی مزید گلاب کے پھولوں کی چادریں بندھی تھیں۔

قبر پر سرخ اور گلابی پتیاں بکھیردی گئیں اور ان پر پانی چھڑ کنے کے بعد نئے سرے سے اگربتیاں بیچ بیچ میں گاڑھی گئیں۔ کسی نے بچی ہوئی اگربتیوں کا ایک مٹھا سا بنایا اور اسے سگریٹ لائٹر سے سلگاکر قبر کے سرھانے پر نصب کردیا۔

ایسا لگتا تھا میری قبر سے اٹھتے ہوئے دھوئیں نے اس ویرانے میں زندگی کی روح پھونک دی ہے، بچے کھیل رہے ہیں، ادھر آدھر کتنے پھر رہے ہیں اور کسی گھر سے کھانا پکنے کی علامت دھواں اٹھ رہا ہے

اب انتظامات مکمل ہوچکے تھے اور بلائے جانے پر لوگ پھرتی سے دور دور تک کی ان قبروں پر سے جن پر سایہ تھا کود کود کر میری قبر کے نزدیک آگئے۔

پہلے فاتحہ ہوئی اور اس خاموشی میں مجھے دور سے کسی مرد کے عورت سے لڑنے کی آواز سنائی دی۔

اس کے بعد ایک چپراسی نے جسے لوگ مولینا کہہ کر اب تک پکار رہے تھے اپنی تقریر شروع کی حالانکہ اس کیلئے اسے کسی نے دعوت نہیں دی تھی۔ وہی گھسا پٹا پیغام

جو میں بارہا سن چکا تھا۔ اعمال، موت، صبر اور بے ثباتی —— اور اس بے رنگ تقریر کو دلچسپ بنانے کیلئے حکایتوں، اور پٹے ہوئے اشعار کا سہارا۔

کسی نے کہا "مولینٰا ذرا مختصر کرو"

اور بھی میں بھی اندر سے کہنا چاہتا تھا۔

مولینٰا نے مجمع کا مزاج بھانپتے ہوئے دوبارہ فاتحہ اور درود کیلئے ہاتھ اٹھادئیے اور ابھی ان کے ہاتھ نیچے نہیں ہوئے تھے کہ لوگ پسینہ پونچھتے ہوئے وہاں سے کھسکنے لگے -

میر ظہیر عباس روستمانی

انہوں نے بس تک پہنچنے کیلئے قبروں پر سے چڑھتے ہوئے یا انہیں پھلانگ کر مختصر سے مختصر راستہ قبرستان کی اس بھول بھلیاں میں ڈھونڈھ نکالا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ قبر کھودنے والا چل رہا تھا جو اپنی کلہاڑی سے بے جا اگی ہوئی کانٹوں دار شاخوں کو کاٹ کر ان کیلئے راستہ بناتا جاتا تھا۔

اسے میرے لڑکے نے پانچ نوٹ دئیے اور اس کے فوراً ہی بعد وہ مزید جھاڑیاں کاٹ کر ان کیلئے راستہ بنانے کی خدمت کو غیر ضروری سمجھ کر اپنی جھونپڑی کی طرف چل پڑا جو قبرستان کے ایک دوسرے ہی حصے میں بنی ہوئی تھی۔

میری بیوی کے خالو وکیل ہیں لیکن ان کا اوسط شاید ایک کیس فی مہینہ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے گورکن کے وہاں سے ہٹتے ہی کہا

"بھئی واہ۔ پیشہ یہ ہے۔ اگر روز کی پانچ قبریں بھی کھودلیں تو سمجھ لیجئیے ہزاروں پڑھے لکھوں سے جو دن بھر مغز ماری کرتے ہیں آپ نے چند گھنٹوں میں زیادہ کما لئے"۔

Scanned by CamScanner

کارتوسوں والے بھتیجے نے کہا "مگر چھوٹے خالو اس میں بھی قسمت کی بات ہے۔ ہوسکتا ہے اس کی جگہ کوئی آپ جیسا پڑھا لکھا لگ جائے اور مہینہ بھر میں ایک بھی آدمی سارے شہر میں مرکے نہ دے"

ان لوگوں کی آوازیں جس میں دبے دبے سے قہقہے بھی شامل تھے، دور ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بس اور کاروں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر انجن اسٹارٹ ہوئے اور ان کے پیچھے دھول کے بادل نے قبرستان کے دروازے کو، اگر کوئی تھا تو، اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا "تم ہو کہاں؟"

اس نے کہا "ہوں کہاں؟ گیا کہاں تھا!!

میں یہیں موجود ہوں جہاں تم ہو
گئے کہاں تھے۔ کہاں سے آئے
یہیں تھے، یہیں رہے، یہیں رہینگے"۔

میں نے کہا "یا تو تم سندھی صوفی شاعروں کو پڑھتے رہے ہو یا بھکتی شاعری نے تمہیں متاثر کیا تھا۔ تمہارے گھوڑا رے گھوڑا چلانے پر میں تو ڈر گیا تھا کمبختوں نے مجھے تمہارے اوپر تو نہیں دے پٹکا ہے"

وہ ہنسا اور ہنستے ہوئے بولا "یہی کیا ہے سائیں۔ میں تمہارے نیچے موجود ہوں"

مجھے اپنی پیٹھ میں کھوؤں کے بیچ کوئی چیز گڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے پوچھا

"کیا میرے کُلّوں کے بیچ میں تمہارا سر ہے؟ میرا مطلب سندھی کے کُولّے سے ہے اردو کے کولھے سے نہیں"

اس نے کہا "ہاں تمہارے سندھی کولہوں کے عین نیچے میرا سر ہے، وہ گڑھ رہا ہوگا۔ آئی ایم ساری پر آئون چا کریان سائیں" (پرآئون چھا کریاں سائیں)

"کچھ نہیں۔ لیٹے رہو" میں نے کہا "تم باقی کہاں ہو؟"

میر ظہیر عباس روستمانی

اس نے ایسی آواز میں جو بلغم پٹے ہوئے سینوں سے نکلتی ہے کہا "لمبی ہڈیاں یہاں اکثر چوری ہوجاتی ہیں، کبھی کبھی میں نے کتوں کو بھی ان سفید ہڈیوں سے کھیلتے دیکھا ہے۔ بیچارے کھیلنے کے سوا انہیں اور کس مصرف میں لا سکتے ہیں۔ گوشت تو گوشت اندر کی رطوبت اور سرخی تک کیڑے کھاکر برابر کردیتے ہیں۔ جگہہ کی تنگی ہے لوگ ایک دوسرے پر ہی سوار کرائے جاسکتے ہیں۔ جب وقت آتا ہے اس کا پھاوڑا کچی زمین پر کہیں بھی گر سکتا ہے مثلاً جس طرح آج میرے سر پر گیرا۔ آرڈر دینے والے منّت سماجت سے اسے وقت پر قبر تیار رکھنے کیلئے کہہ کر چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پکّی قبروں کے بیچ میں چھوڑے ہوئے راستوں پر نظر دوڑاتا ہے جہاں پہلے کوئی بڑھیا دفن ہو جس کا کوئی ولی وارث نہیں ہے، یا کوئی بچہ جسے کپڑے میں لپیٹ کر بغیر نماز جنازہ پڑھائے مٹی کے حوالے کردیا گیا ہے۔ پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے قبر کھودنی شروع کرتا ہے۔ پچھلے گڑھے پر چونکہ محنت نہیں کرنی پڑتی ہے اس لئیے جیسے ہی چھت پھٹتی ہے اور روشنی میں اندر کا حصّہ نظر آنے لگتا ہے وہ اطمینان کا پھنکارا بھرتا ہے ـــــ باقی کام آسان ہوتا ہے، ضرورت کے مطابق قبر کو چھوٹا یا بڑا کرنا اور لمبی ہڈیوں کو یا تو اِدھر اُدھر کے بھٹّوں میں گھسا کر

سوراخ کو مٹی سے پاٹ دینا یا کسی جگہہ ایک، دو فٹ گھرا گڑھا فرش میں کرکے اسے بھی مٹی سے ڈھک دینا۔

ایک دن اتفاق سے قبر میں اترنے والوں میں سے ایک کا پیر ایسے ہی ایک گڑھے پر پڑا اور ایک لمبی ہڈی اس کے تلوے میں گڑھی۔ اس نے چیخ ماری کیونکہ ران کی بے گوشت پوست ہڈی اس کے ایک پائینچے میں گھس گئی تھی۔ قبر کے ایٹی کیٹ اور دفنانے کا پروٹوکول بھول کر اس نے اپنے مُردے کو زمین پر پھینکا اور خود قبر سے نکل کر بھاگا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا دوسرا ساتھی تھا اور باقی باراتی بغیر وجہ جانے ہوئے قبرستان سے باہر نکل جانے کی جلدی میں انتہائی تیزی سے دوڑ رہے تھے۔

میر ظہیر عباس روستمانی

تو یہ ہیں یہاں کے شب و روز"

میں نے کہا "خیر مجھے ان سب باتوں کی فکر نہیں تھی اور نہ ڈر تھا۔ مجھے زندگی میں ہمیشہ اس بات پر ہنسی آتی ہے کہ لوگ کھوپڑیوں، ڈھانچوں اور لمبی ہڈیوں سے ڈرتے اور ڈرائے جاتے ہیں اور خود کھوپڑی، پسلی اور ہڈیاں اپنے جسم میں چھپائے پھرتے ہیں

مجھے ڈر کسی اور ہی بات کا تھا"

اس نے پوچھا "کاھے کا سائیں؟"

"یہی کہ وہ میری قبر چھوٹی نہ بنادے"

اس نے وہی بلغم سے اٹے ہوئے سینے میں سے نکلنے والی آواز میں ایک قہقہہ لگایا اور بولا "ارے نہیں وہ بڑا تجربہ کار گورکن ہے۔ اس کی بنائی ہوئی قبر کبھی چھوٹی نہیں پڑتی۔ کم سے کم میں نے آج تک چھوٹی ہوتے نہیں دیکھی ھے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ھے کہ ایسی کشادہ قبر بنائے جس میں ڈنکے کی چوٹ پر سود پر روپیہ چلانے والا مسلمان بھی سکھ کی نیند سو سکے"

Scanned by CamScanner

میں نے کہا "تو اس نے اس اعتقاد کے غبارے میں چھید کر دیا ہے کہ بیاجوؤں پر اور دوسروں کی زمین پر قبضہ کرنے والوں کو قبر تین بار قبول کرنے سے انکار کرتی ہے"۔

میرے ساتھی نے کہا "اس کی بنائی ہوئی قبر کبھی نہیں سکڑتی خواہ وہ کسی کیلئے بھی ہو ــ حتیٰ کہ کھلم کھلا رشوت لینے اور دے کر اپنا کام نکالنے والوں کیلئے بھی نہیں"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے زمین کی بھی کوئی فطرت ہوتی ہو اور وہ بھی بدلتی رہتی ہے"۔

میر ظہیر عباس روستمانی

میرے ساتھی نے کچھ دیر بعد کہا "زمین اسے آج تک دھوکا نہیں دے پائی۔ اگر اس نے دھوکا کھایا ہے تو زندگی میں صرف ایک بار اور وہ بھی ایک آدمی کے ہاتھوں۔

کچھ سال پہلے ایک آدمی یہاں آیا اور اس نے اس ساتھ والی قبر پر بیٹھے ہوئے ایک موالی سے پوچھا 'قبر کھودنے والے صاحب کہاں ہیں؟'

اس نے کہا 'میں ہی ہوں ۔ فرمائیے'

پوچھنے والے نے کہا 'میرا چار سال کا لڑکا مر گیا ہے اور اسے ظہر کی نماز کے بعد دفنانا ہے'

موالی نے کہا 'وقت تھوڑا ہے'

اس آدمی نے کہا 'میں نائی کا کام کرتا ہوں اور بہت غریب ہوں'

موالی نے کھوجنے والے لہجے میں کہا 'اپنی دوکان ہے؟'

نائی نے کہا 'نہیں ملازم ہوں'

موالی نے عام کوٹیشن سے کم پیسے طلب کئے جو

نائی نے فوراً اداکردئیے۔ لیکن جب بیچ دوپہر میں وہ جنازے کو لیکر آئے تو نہ وہاں قبر تھی نہ گورکن۔

اور جس گورکن کے تجربے پر تم شک کر رہے تھے اُس نے سارا واقعہ سنکر ایک بچے کی قبر پر جو مٹی کا ڈھیر تھی تین چار ٹھوکریں غصّے کے عالم میں ماریں۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا 'وہی حرامی ہوگا۔ وہی سالا موالی'

ایسا لگتا تھا اس کا غصّہ ٹھنڈا ہونے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ موالی کی لاش تین، چار دن بے گور اس کے سامنے پڑی رہے اور وہ اُس سے کہے "کیوں بچہ۔ تم نادھند سہی مگر میرے ھاتھوں سے بچ کر جانے والے نہیں تھے'

بالآخر نائی نے اِدھر اُدھر سے مانگ کر مزید کچھ رقم جمع کی اور جب تک ایک پرانی قبر اس بچے کیلئے تیار ہو مغرب کا وقت ہوچکا تھا۔ اُس پرانی قبر سے نکلنے والی چھوٹی بڑی ھڈیوں کو اس نے اِدھر اُدھر کردیا اور کھوپڑی برابر کی جھاڑی میں اچھال دی جس سے کچھ دن تک بچے فٹ بال کاکام لیتے رہے۔

لیکن اس خسارے کو گورکن نے جلد ہی پورا کرلیا اور شاید چالیسویں کیلئے جب نائی اور اس کے گھر والے وہاں آئے تو اس جگہ کسی بڑے آدمی کی قبر بن چکی تھی۔ ظاھر ہے وہ اس چھ، سات فٹ کی قبر پر اپنے دو، ڈھائی فٹ کے بچے کی فاتحہ نہیں پڑھ سکتے تھے"۔

پھر اس نے مجھ سے پوچھا "تم چالیس دن تک گھر کا چکر نہیں لگاؤگے؟ آج تمہیں مرے ھوئے دوسرا دن ہے"

میں نے کہا "بس پہلا دن وہاں گذار لیا۔ اتناہی کافی ہے۔ میں اسے دیکھ سکونگا اور بچوں کو بھی لیکن نہ وہ مجھے دیکھ سکے گی نہ بچے۔ پھر گھر کا چکر لگانے کا فائدہ؟"

Scanned by CamScanner

"پھر تو ان کا سرِشام لوبان سلگانا اور کھانا دینا بیکار ہی جائیگا"

"تمھارا کام میں آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کہا "اب اتنے دن بیت چکے ہیں کہ میں سب کچھ بھول چکا ہوں"

کچھ دیر ہم خاموش لیٹے رہے جیسے ٹرین میں اوپر اور نیچے کی برتھ کے دو مسافروں میں گفتگو ہو رہی تھی اور یکلخت دونوں بولتے بولتے تھک گئے۔

میر ظہیر عباس روستمانی

کچھ دیر بعد اس نے مجھ سے پوچھا "تم نے یا یوں کہنا بہتر ہوگا تمہارے گھر والوں نے اس قبرستان کا انتخاب کیوں کیا؟"

میں نے کہا "اس میں خرابی کیا ہے — ہر طرف زندگی کے آثار ہیں۔ جانے پہچانے اشعار پڑھنے کو مل رہے ہیں مثلاً اس قبر پر جس پر ایک صاحب سستا رہے ہیں پڑھو کیا لکھا ہے

اے کہ برما بگذری دامن کشاں
از سرِ اخلاص الحمد ے بخواں

اور وہ ترچھی قبر جس کو دیکھ کر لگتا ہے دلّی پہنچ گیا ہوں معلوم ہوتا ہے کوئی صاحبہ اس میں آرام فرما رہی ہیں۔ لکھا ہے

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

اور وہ دیکھئے

پھول تو کچھ دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

قبر کی عمر دیکھتے ہوئے لگتا ہے اب تک تو بیچارے بن کھلے غنچے کو رونے والے بھی چلتی پھرتی دنیا سے رخصت ہو چکے ہونگے کہاں کا غم اور کیسا صدمہ۔ اور وہ قبر جس پر دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں جس پر لکھا ہے

اے خاکِ تیرہ خاطرِ مہماں نگاہ دار
ایں نورچشم ماست کہ در بر گرفتہ۔"

اس نے کہا "وہ دونوں چرس کا کاروبار کر رہے ہیں خالی باتیں نہیں۔ اور بے ترتیب قبریں، کتے، نجاست، مختلف مردوں کی ہڈیوں سے پر گڑھے، کفن چور ان سب کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تمہارا کس جماعت سے تعلق ہے؟"

میں نے کہا "اکثریت کی جماعت سے جو بے نام ہے"

میر ظہیر عباس روستمانی

اس نے کہا "ہاتھ ہوتے تو کہتا ملاؤ ہاتھ۔ تم بھی شاید میری ہی طرح ہو۔ اگر کسی کمرشیل مذہبی فرقے یا جماعت سے تمہارا تعلق ہوتا تو زندگی ہی میں تمہاری جگہ ریزروڈ کرلی جاتی جس طرح اچھے ریسٹورینٹس یا سنیما ہالوں میں میز یا سیٹ ریزروڈ ہوتی ہے۔ اور پھر یہ کہ ان میں تدفین کے حقوق ریسٹورینٹس کے داخلے کی طرح محفوظ ہوتے ہیں صرف اپنی کمیونٹی والوں کیلئے۔ یہ نہیں کہ جو ایرا غیرا آیا آسے جگہ دے دی۔ مختصر یہ کہ تمہارا تعلق تاجروں کے کسی فرقے سے نہیں ہے اس لئے یہاں پڑے ہو"

میں نے کہا "اگر بالفرض مجھے وہاں جگہ دے بھی دی جاتی تو میری سمجھ میں ان کی زبان نہیں آتی"۔

"یہاں تھوڑی بہت ریزروڈ جگہ اگر ہے تو ان کی جن کی عالیشان مقبرہ نما قبریں ہیں۔ مثلاً وہ سامنے والا

Scanned by CamScanner

چھوٹا سا ہرے گنبد کا مینار۔ صاحبِ گور خوش ہونگے کہ ہر سال ان کا عرس منایا جاتا ہے۔ اور ہزار قبریں تلپٹ ہوجائیں ان کی قبر اپنی جگہہ پر قائم رہے گی۔ قسمت نے مرحوم کے ساتھ بھی کیا کھیل کھیلا ہے!"

"کیسا کھیل؟" میں نے پوچھا

"مرحوم تلملانے ہونگے" وہ بولا "جب عرس کی چادریں نہ صرف ان پر چڑھتی ہونگی بلکہ ان کے اوٹ پٹانگ ساتھیوں پر بھی اور عرس منانے والے بھی نہیں جانتے ایک کے ساتھ وہ کتنوں کا عرس منا رہے ہیں اور کتنوں سے جن میں جواری بھی تھے اور شرابی بھی کرم کی بھیک مانگ رہے ہیں"

میں نے کہا "یار تمہیں وہ رنگین تصویر یاد ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد کہیں کہیں دیکھنے میں آتی تھی؟"

اس نے کہا "کونسی؟"

"یالٹا کانفرنس والی"

"اس میں کیا تھا؟"

میں نے کہا "اس میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ایک ساتھ چرچل، روزویلٹ، اسٹالن اور چیانگ کائی شیک بیٹھے تھے اور اس تصویر میں ایک بھوت کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا جو کیمرے کی زد سے بچ نکلا تھا لیکن پھر بھی وہیں ان کے پیچھے چھپا کھڑا تھا"۔

اس نے پوچھا "کس کا بھوت؟"

"ہٹلر کا جس کے خوف نے چاروں کو یکجا کردیا تھا۔ اور آج یہاں لیٹ کر مجھے احساس ہورہا ہے انگریزی میں وہ جو کہتے ہیں 'برا وقت بھی کیسے کیسوں کو ایک ہی بستر کا ساتھی بنا دیتا ہے' تو سائیں میرا تو خیال ہے یہ

Scanned by CamScanner

ضرب المثل یقیناً کسی نے قبر ہی سے باہر کی دنیا میں پہنچائی ہو گی"۔

نیچے خاموشی رہی۔

میں نے پوچھا "سنتے ہو؟"

پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا

میں نے سوچا ممکن ہے مرحوم کو مجھے دفن کرنے والوں کو دیکھ کر گھر والوں کی یاد آئی ہو اور۔۔۔

—

مہر ظہیر عباس روستمانی

Scanned by CamScanner

حسن منظر کو دیکھنے دکھانے کا فن خوب آتا ہے۔ اس کا افسانہ بصارت اور بصیرت کی آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔ بصارت زندگی کے حسن و قبح کو کیمرے کی سچائی کے ساتھ دیکھتی ہے اور بصیرت ایکسرے کے تجزیاتی عمل سے اس کی تصدیق کرتی ہے۔ انسانی فطرت اور نفسیات کا کوئی پہلو اس کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتا۔

اس کے افسانے ایک ایسے سیلانی کے سفر کی روداد سناتے ہیں جو اپنی فکر کا چراغ لیکر اس انسان کی تلاش میں نکلا ہے جو زندہ ہو اور دوسروں کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کرتا ہو۔ اس نے دنیا کی خاک چھانی ہے اور ملک ملک کی خاک سے سونے کے ذرے جمع کئے ہیں۔ یہی سنہری ذرے اس کے افسانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

اردو افسانے میں حسن منظر کی آواز مانوس اور جاندار ہونے کے ساتھ ساتھ نئی بھی ہے اور منفرد بھی۔ اس کے افسانے بیداری کے خواب ہیں جو آپ اپنی تعبیر ہوتے ہیں۔

حسن منظر کے افسانے پڑھ کر سب سے پہلا خیال یہ آتا ہے کہ مدتوں بعد کسی افسانہ نگار نے سماجی زندگی کی حقیقی تصویر کشی بڑی جرأت کے ساتھ کی ہے۔ ان کے افسانوں نے نہ صرف اردو افسانوی ادب میں معیاری تخلیقات کا اضافہ کیا ہے بلکہ مختصر افسانہ نگاری کا وہ اعتبار بھی بحال کیا ہے جو 'مصالحت کوشی' اور 'منافقت' کے ہاتھوں مجروح ہو چکا تھا۔

حسن منظر نے اپنے افسانوں میں جزیات نگاری کو بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے، جس سے ان کی کہانیوں میں دلچسپی کا عنصر بھی ابھرا ہے اور معنویت بھی پیدا ہوئی ہے۔

اپنے افسانوں میں انہوں نے نہ تو محض روایت پسندی سے کام لیا ہے اور نہ روایت شکنی کو اپنایا ہے کیونکہ ان کے پیش نظر سب سے اہم مقصد اپنے موضوعات کو انکی تمام جزئیات و تفصیلات کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پر اثر انداز میں اپنے قاری تک پہونچا کر اس کے شعور کی تشکیل کرنا ہے۔

میر ظہیر عباس روستمانی

Scanned by CamScanner